کارِ انبیاء:
تقاضے اور حکمتیں



عاصم افتخار

KAR E ANBIYA-TAQAZE AUR HIKMATEN

AASIM IFTEKHAR

Published by Qist Institute
Year of Publication: 2025

به نام خداوندِ جان آفرین

اس کتاب کو ان تمام مخلص داعیوں کے نام کرتا ہوں جو اللہ کی راہ میں ہدایت کا پیغام پہنچانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

مقدمہ



اسلام ایک ہمہ گیر دین ہے جو محض عبادات و رسوم تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو سے متعلق راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو فرد، خاندان، معاشرہ اور قوم کو روشنی عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو اپنی بندگی کا حکم دیا ہے، اسی طرح اس بندگی کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا بھی اس امت کے ذمہ فرض کیا ہے۔

دعوتِ دین دراصل نبوت کی وہ عظیم ذمہ داری ہے جو ختم نبوت کے صدقہ انبیاءِ کرام علیہم السلام سے منتقل ہو کر امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بن چکی ہے۔ قرآن مجید میں بارہا اس فریضے کی جانب متوجہ کیا گیا اور امت کو "خیرِ امت" اسی لیے قرار دیا گیا کہ وہ لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ یہی وہ فریضہ ہے جو اس امت کو دیگر اقوام پر ایک گواہ کی حیثیت سے متعارف کرواتا ہے۔

آج کا دور مادّیت، الحاد، بے راہ روی، نظریاتی انتشار اور روحانی خلا کا دور ہے۔ انسان فطرت سے دور اور ضمیر سے ناآشنا ہو چکا ہے۔ ایسے میں اگر امت مسلمہ اپنی دعوتی ذمہ داری سے غفلت برتے، تو انسانیت کی نجات کی راہیں مزید تنگ ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں دعوتِ دین کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی

ہے، دعوت کے عملی و مؤثر طریقے پیش کیے گئے ہیں، اور ایک کامیاب داعی کے اوصاف وصفات کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ امت کے ہر فرد کے دل میں دعوتِ دین کا درد پیدا ہو، وہ خود کو اس کام کا ذمہ دار سمجھے، اور اپنے دائرۂ کار میں اس فریضے کی انجام دہی کی سعی کرے۔ ہمارا یقین ہے کہ جب امت اس عظیم مشن کو شعوری طور پر اپنائے گی تو دنیا میں ہدایت کی شمعیں روشن ہوں گی اور انسان گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر نورِ حق کی طرف گامزن ہوں گے۔

دعوت کا مفہوم

دعوت محض ایک اصطلاح نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے، ایک فریضہ ہے، زندگی کا ایک طرز ہے۔ یہ دراصل دلوں کو جگانے، انسانوں کو رب سے جوڑنے، اور گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتی انسانیت کو ہدایت کی روشنی کی طرف بلانے کا عمل ہے۔ دعوت، اللہ کے اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا نام ہے جو انسان کی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور جس کے بغیر انسان کی روح بے قرار اور راستہ بے نشان رہتی ہے۔

لغت میں "دعوت" کا مطلب ہے پکارنا، بلانا، متوجہ کرنا۔ لیکن شرع میں اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ دعوت دین کا مطلب ہے انسان کو اس کے حقیقی مقام کی طرف بلانا۔ یعنی عبدیتِ کاملہ، رب کی بندگی، رسول کی اتباع، اور آخرت کی فکر۔ یہ ایسا عمل ہے جس میں داعی نہ صرف الفاظ سے کام لیتا ہے بلکہ اپنے کردار، اخلاق، اور رویے سے بھی پیغامِ حق کو پیش کرتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا:

"ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ"-"اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو۔"

یہاں دعوت کی نسبت "رب کے راستہ" کی طرف کی گئی ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ دعوت کا راستہ، مقصد اور روح سب کچھ اللہ سے جڑا ہوا ہے۔

دعوت انبیاءِ کرام علیہم السلام کا مشن رہا ہے۔ ہر نبی نے اپنے دور کے حالات کے مطابق اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلایا۔ کبھی تنبیہ کے ذریعے، کبھی خوشخبری کے ذریعے، کبھی کردار کے ذریعے، تو کبھی سیاست کے ذریعے۔ دعوت کوئی وقتی عمل نہیں بلکہ صبر، تدبر، اخلاص اور تسلسل کا نام ہے۔

دعوت صرف غیر مسلموں تک دین پہنچانے کا نام اور کام نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو دین کی طرف بلانا بھی دعوت ہے۔ جو دین سے دور ہو چکے ہوں، جو غفلت میں ہوں، جو بدعتوں اور بدعملیوں کا شکار ہوں -ان سب کو محبت، خیر خواہی اور حکمت کے ساتھ یاد دہانی کرانا بھی دعوت ہے۔

دعوت محض تقریر کا نام نہیں، یہ ایک طرزِ زندگی ہے۔ ایک داعی ہر وقت، ہر حالت میں، اپنی چال، بات، اخلاق، اور نرمی کے ذریعے دعوت دیتا ہے۔ بعض اوقات خاموشی بھی دعوت بن جاتی ہے، جب وہ خاموشی وقار اور تقویٰ کے ساتھ ہو۔

پس دعوت کا مفہوم ایک پکار ہے - جو رب کی طرف بلاتی ہے، ایک امید ہے - جو دلوں میں نور بھرتی ہے، ایک چراغ ہے - جو گمراہی کے اندھیروں کو چیرتا ہے، اور ایک امانت

ہے-جو ہر مسلمان کے کندھوں پر ہے۔ یہ نہ صرف ایک فریضہ ہے بلکہ ایک اعزاز ہے کہ انسان اللہ کا پیغام، اللہ کے بندوں تک پہنچائے۔

دعوتِ دین کی موجودہ ضرورت

ہر دور میں انسانیت کو دعوتِ دین کی ضرورت رہی ہے، لیکن آج کے زمانے میں یہ ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو چکی ہے۔ دنیا ایک عجیب فکری انتشار، روحانی خلا اور تہذیبی انحطاط کی لپیٹ میں ہے۔ مادّیت نے انسان کی آنکھیں چکاچوند کر دی ہیں، لیکن اس کے دل اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے فاصلے تو مٹا دیے ہیں، مگر دلوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ بظاہر تہذیب نے ترقی کی ہے، مگر انسان اپنی حقیقت سے، اپنے رب سے اور اپنی اصل فطرت سے کٹ چکا ہے۔

ایسے ماحول میں دعوتِ دین ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے جو انسان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ محض ایک مادی وجود نہیں، بلکہ اس کی روح کی ایک پکار ہے، اس کے دل کی ایک پیاس ہے، اور اس کی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ آج کا انسان سہولیات اور آسائشی سامان کے باوجود بے سکون ہے، معلومات کے باوجود گمراہ ہے، اور آزادی کے باوجود قید میں ہے۔ اس کی اصل نجات صرف وحی کے اس پیغام میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے بھیجا، اور جسے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔

دعوتِ کی موجودہ ضرورت اس لیے بھی دوچند ہو گئی ہے کہ آج کے مسلمان خود اپنی شناخت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ نئی نسل مغربی افکار، میڈیا، سوشل نیٹ ورکس اور تعلیمی اداروں کے زیرِ اثر ایک ایسے سانچے میں ڈھل رہی ہے جہاں اسلامی فکر، اقدار

اور طرزِ زندگی اجنبی بن چکی ہے۔ مسلمانوں کے اندر دین کے بارے میں لاعلمی، بے عملی، اور بیزاری جیسے رویے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر دعوت کا کام نہ کیا گیا، تو یہ نسل نہ صرف خود راہِ راست سے ہٹے گی، بلکہ اگلی نسلوں کو بھی تاریکی کی طرف لے جائے گی۔

آج دنیا بھر میں اسلام کے خلاف ایک منظم فکری یلغار جاری ہے۔ اسلاموفوبیا، بدگمانیاں، اور میڈیا کی غلط تصویریں ذہنوں میں بٹھائی جا رہی ہیں۔ ان حالات میں اگر امت مسلمہ خاموش بیٹھ جائے، اور دعوت کے میدان سے پیچھے ہٹ جائے، تو سچائی اور ہدایت کا چراغ کیسے روشن ہو گا؟ یہی وہ وقت ہے جب ہر فرد کو داعی بن کر میدان میں آنا چاہیے - نہ صرف قول سے، بلکہ عمل سے؛ نہ صرف تحریر سے، بلکہ کردار سے۔

دعوتِ دین کی موجودہ ضرورت ایک فکری، اخلاقی اور انسانی ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف دین کے غلبے کا ذریعہ ہے، بلکہ انسانیت کی بقا کا راستہ بھی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن ہو، انسانیت کو سکون ملے، اور قیامت کے دن اللہ کے حضور ہم سرخرو ہوں، تو ہمیں آج، ابھی، اور یہیں دعوت کے کام کو اپنی اولین ترجیح بنانا ہو گا۔

کتاب کے مقاصد

یہ کتاب ایک ایسے وقت میں تحریر کی جا رہی ہے جب امت مسلمہ فکری انتشار، عملی جمود، اور دعوتی غفلت کا شکار ہے۔ دنیا میں فتنوں کی یلغار ہے، باطل نظریات کا سیلاب ہے، اور نئی نسل اپنی پہچان سے بے خبر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے نازک حالات میں

ضرورت اس بات کی ہے کہ امت کو اس کے اصل مشن کی طرف واپس بلایا جائے۔ یہی مقصد اس کتاب کا اولین محرک ہے۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد امت مسلمہ کے ہر فرد کے دل میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ دعوتِ دین صرف علماء یا مقررین کا کام نہیں، بلکہ ہر مسلمان کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داری ہے۔ یہ پیغام ہر اس شخص کے لیے ہے جو کلمۂ طیبہ پڑھ چکا ہے، کہ وہ اس کلمے کو صرف زبان تک محدود نہ رکھے بلکہ اسے دنیا تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

یہ کتاب چاہتا ہے کہ دعوت کا مفہوم محض تقریر یا نصیحت تک محدود نہ رہے، بلکہ یہ بات دلوں میں اُترے کہ دعوت دراصل ایک طرزِ زندگی ہے۔ یہ وہ طرزِ عمل ہے جس میں ہر مسلمان اپنے کردار، سلوک، معاملات اور تعلقات کے ذریعے ایک چلتا پھرتا داعی بن جائے۔ دعوت صرف زبانی نصیحت نہیں، بلکہ قول و فعل کی یکجائی، حکمت اور اخلاق کی عملی تصویر ہے۔

یہ کتاب اس لیے بھی مرتب کیا گیا ہے کہ آج کا قاری نہ صرف دعوت کی ضرورت اور اس کے مقام کو سمجھے بلکہ یہ بھی جانے کہ کس طرح وہ اپنی محدودات میں رہتے ہوئے بھی دعوت کے عظیم مشن کا حصہ بن سکتا ہے۔ چاہے وہ ایک استاد ہو یا طالب علم، ایک تاجر ہو یا مزدور، ایک والد ہو یا بیٹا- ہر فرد اپنے دائرے میں ایک داعی کا کردار ادا کر سکتا ہے۔

اس کتاب کی ایک اور اہم غرض یہ ہے کہ موجودہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے دعوت کے مؤثر، متوازن اور حکیمانہ طریقے سامنے لائے جائیں، تاکہ جذبات کے ساتھ

ساتھ فہم و بصیرت بھی دعوت کے سفر کا حصہ بنے۔ صرف جوش نہیں بلکہ دانشمندی، صرف بات نہیں بلکہ حکمتِ بیان، صرف نیت نہیں بلکہ سلیقہ بھی دعوت کے میدان میں درکار ہے-اور یہ کتاب اسی شعور کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

آخر میں، یہ کتاب داعی کے اوصاف کو اجاگر کرتا ہے تاکہ دعوت ایک سنجیدہ، متوازن، اور بامقصد مشن بنے۔ کیونکہ جب داعی کا دل درد سے لبریز ہو، زبان حق گو ہو، اور کردار آئینۂ صداقت ہو، تب ہی دعوت بارآور ہوتی ہے۔

الغرض، یہ کتاب دعوت کو ایک زندہ حقیقت اور ایک ہمہ گیر ذمہ داری کے طور پر سمجھانے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔ اگر اس کے ذریعے ایک بھی دل میں دعوت کا چراغ روشن ہو جائے، تو یہی اس کی کامیابی اور ہمارے لیے باعثِ نجات ہے۔



باب اول: دعوتِ دین کا مفہوم، اہمیت اور موجودہ ضرورت



دعوت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

"دعوت" عربی زبان کا لفظ ہے جو "دعا، یدعو" سے ماخوذ ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں: بلانا، پکارنا، متوجہ کرنا۔ کسی کو کسی طرف بلانے کے عمل کو "دعوت" کہا جاتا ہے۔ یہ بلانا کبھی مادی چیزوں کی طرف ہوتا ہے، جیسے کھانے کی دعوت؛ اور کبھی فکری یا روحانی پہلوؤں کی طرف، جیسے کسی نظریے، عقیدے یا عمل کی طرف بلانا۔ دین کے تناظر میں جب "دعوت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد مخصوص طور پر اللہ کے دین کی طرف بلانا، اس کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا، اور انسانوں کو اللہ کی بندگی، رسول کی اطاعت اور آخرت کی جوابدہی کی طرف راغب کرنا ہوتا ہے۔

اصطلاحی طور پر "دعوتِ دین" کا مطلب ہے: لوگوں کو اسلام کے عقائد، عبادات، اخلاق، اور احکام کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت دینا؛ اُنہیں ان کے خالق و مالک سے جوڑنا؛ اور ان کے اندر یہ شعور بیدار کرنا کہ ان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ یہ محض تقریر یا نصیحت نہیں بلکہ ایک ایسا جامع عمل ہے جو انسان کے دل و دماغ کو مخاطب کرتا ہے، اس کی سوچ کو بدلتا ہے، اور اس کے رویے کو اللہ کے احکام کے تابع بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

دعوت دراصل اللہ اور بندے کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے کا عمل ہے۔ یہ ایک روحانی پکار ہے جو دلوں کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے۔ ایک داعی جب کسی کو دین کی طرف بلاتا ہے تو وہ دراصل اس کی فطرت کو جگاتا ہے، اس کے اندر موجود خیر کی طلب کو راستہ دکھاتا ہے، اور اس پر حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

قرآن مجید نے دعوت کو "سبیل ربک "یعنی" تیرے رب کے راستے کی طرف بلانا" کہا ہے۔ اس تعبیر میں دو عظیم اشارات پوشیدہ ہیں: ایک یہ کہ دعوت کسی ذاتی مفاد، گروہی تعصب یا قومی برتری کی طرف نہیں بلکہ رب کے راستے کی طرف ہوتی ہے؛ اور دوسرا یہ کہ دعوت کا راستہ ایک منظم، روشن اور مستحکم راستہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کی سنت اور وحی الٰہی کی روشنی سے روشن ہے۔

چنانچہ دعوت کا مفہوم نہایت جامع اور گہرا ہے۔ یہ فرد کی اصلاح سے لے کر قوم کی تعمیر تک، اور دل کی تبدیلی سے لے کر سماج کی تطہیر تک ایک مسلسل اور ہمہ جہت عمل ہے۔ یہ کام صرف زبانی باتوں سے نہیں، بلکہ اخلاص، صبر، حکمت اور بہترین اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ دعوت دین، ایک انسان کو اس کی اصل فطرت، مقصدِ زندگی، اور آخرت کی تیاری کی طرف بلانے کا نام ہے۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جس پر انبیاء کو مبعوث کیا گیا اور ختم نبوت کے صدقہ آج امتِ مسلمہ کے سپرد ہے۔

قرآنِ مجید میں دعوت کا تصور

قرآنِ مجید کو اگر غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف احکام و عقائد کی کتاب نہیں بلکہ ایک دعوت نامہ ہے۔ ایک ایسی نازل شدہ کتاب جو انسان کو اس کے رب کی

طرف بلاتی ہے، اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے، اور اسے کہاں جانا ہے۔ قرآن کا ہر صفحہ، ہر سطر، ایک داعی کی صدا ہے جو دلوں کو ہدایت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

قرآن نے دعوت کو نہ صرف فریضہ قرار دیا ہے بلکہ اسے امت کے وجود کی غایت اور انبیاء کی بعثت کا مرکزی مقصد بتایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي" (یوسف: 108)

ترجمہ: "کہہ دیجیے: یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ بھی جنہوں نے میری پیروی کی۔"

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے متبعین کو بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا، جو واضح کرتا ہے کہ دعوت کا راستہ صرف نبی کا نہیں بلکہ امت کا بھی ہے۔

اسی طرح قرآن نے فرمایا:

"وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" (آلِ عمران: 104)

ترجمہ: "اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

یہ آیت دعوت کو امت کا اجتماعی فرض قرار دیتی ہے اور اس سے پہلو تہی کو خسارے کا سبب بتاتی ہے۔ قرآن مجید نے امت مسلمہ کو "خیرِ امت" اسی بنیاد پر قرار دیا ہے کہ وہ دعوت کی ذمہ داری کو نبھاتی ہے:

"كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ" (آلِ عمران: 110)

قرآن مجید انبیاء کی دعوتی جدوجہد کو بڑے اہتمام سے بیان کرتا ہے - حضرت نوحؑ کی شب و روز کی دعوت، حضرت ابراہیمؑ کی حکمت بھری گفتگو، حضرت موسیٰؑ کی فرعون سے مکالمہ، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صبر آزما تبلیغی زندگی - یہ سب دعوت کے عظیم نمونے ہیں جو قرآن میں محفوظ کیے گئے ہیں تاکہ قیامت تک آنے والے داعیانِ حق ان سے روشنی حاصل کریں۔

قرآن صرف دعوت کا نظریہ نہیں دیتا، بلکہ اس کے اسلوب، حکمت، دلائل اور رویے بھی سکھاتا ہے۔ کہیں نرمی کی تلقین کرتا ہے:

"فَقُولاَ لَهُ قَوْلاً لَيِّنًا" (طه: 44)

کہیں صبر و استقامت کا حکم دیتا ہے، اور کہیں نیکی اور حسنِ اخلاق کو دعوت کا موثر ذریعہ قرار دیتا ہے۔

یوں قرآنِ مجید ایک داعی کے لیے نہ صرف ہدایت کا سرچشمہ ہے بلکہ دعوت کے پورے منہج کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہ کتاب ہر دور کے انسان کو اس کے رب کی طرف بلاتی ہے اور ہر داعی کو روشنی عطا کرتی ہے۔

سنت میں دعوت کا عملی نمونہ

دعوتِ دین کے تصور کو اگر مجسم صورت میں دیکھنا ہو تو سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ مبارکہ ایک کامل داعی کی زندگی تھی - وہ داعی جو سراپا رحمت ہے، جو حکمت و دانائی کا پیکر ہے، جو صبر و استقامت کی مثال ہے، اور جو اخلاق و کردار کا مجسمہ ہے۔

آپ ﷺ کو دین کی دعوت دینے کا پیغام م غارِ حرا کی خلوتوں میں ہوا، جہاں آپ نے کائنات پر غور و فکر، انسان کے مقصدِ حیات پر تدبر، اور خالقِ حقیقی کی جستجو میں شب و روز گزارے اور پھر جبرئیل امین خدا کی طرف سے وحی لیکر نازل ہوئے، جب نبوت کا نور ظاہر ہوا تو آپ نے سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں، دوستوں اور احباب کو خاموشی سے اس پیغامِ حق کی طرف بلایا۔ یہ ابتدائی دعوت کا مرحلہ تھا- پھر جب حکمِ الٰہی آیا:

"وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الأَقْرَبِينَ" (الشعراء: 214)

تو آپ نے علانیہ دعوت کا آغاز فرمایا، صفا پہاڑی پر قریش کو جمع کیا، اور انہیں کھلے انداز میں توحید، نبوت اور آخرت کی دعوت دی لیکن نہ زور، نہ زبردستی، صرف محبت، نرمی اور حسنِ اخلاق۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے تدریج اور حکمت۔ آپ ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح، سماجی پس منظر اور انفرادی مزاج

کے مطابق بات کرتے۔ کسی سے نرمی سے، کسی سے سوال وجواب کی صورت میں، کسی کے شکوک رفع کرتے، تو کسی کے اعتراضات کا جواب عقل ودلیل سے دیتے۔

جب اہلِ طائف نے پتھر مارے، آپ کے جسمِ مبارک کو لہو لہان کیا، تو بھی آپ نے بددعانہ کی بلکہ فرمایا: "مجھے امید ہے کہ ان کی نسل سے اللہ ایسے لوگ پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کریں گے"- یہ ہے دعوت کا دل، یہ ہے صبر، یہ ہے دردمندی۔

مدینہ کی زندگی میں آپ نے دعوت کو ایک اجتماعی عمل میں ڈھال دیا۔ مسجدِ نبوی کو دعوت، تعلیم، اواور ایسا نظامِ زندگی قائم فرمایا جو خود تربیت کا مرکز بنایا۔ غیر مسلم وفود سے مکالمے کیے، خطوط ارسال کیے۔ آپ نے اخلاقی برتری، عدل ورحم، حسنِ معاملہ اور فرد و معاشرہ کی اصلاح سے وہ بنیادیں رکھیں جو رہتی دنیا تک دعوت کا نمونہ بن گئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قول سے نہیں، عمل سے بھی دعوت دی۔ آپ کا صبر، راست گوئی، دیانت، رحم، معافی، اور ہر حال میں اللہ پر توکل- یہ سب دعوت کے ایسے پہلو تھے جنہوں نے دلوں کو موڑا، عقلوں کو قائل کیا، اور انسانوں کو سجدہ گزار بنایا۔

چنانچہ سنتِ نبوی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دعوت کوئی وقتی عمل نہیں بلکہ ایک مسلسل، پرخلوص، اور حکمت سے بھرپور جدوجہد ہے - جس کی بنیاد صبر، اخلاق، اور اخلاص پر ہو تو وہ زبان سے زیادہ دلوں پر اثر کرتی ہے۔

امتِ مسلمہ پر دعوت کی ذمہ داری

اسلام صرف انفرادی نجات کا دین نہیں بلکہ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا، مگر دعوت کا مشن باقی رہ گیا- اور یہ عظیم فریضہ پوری امتِ مسلمہ کو سونپ دیا گیا۔ یہ امت اب صرف عبادت گزاروں کی جماعت نہیں بلکہ ایک "دعوت گزار" امت ہے، جو دنیا کو خیر کی طرف بلانے، بھلائی کا حکم دینے، اور برائی سے روکنے کی امین ہے۔

قرآن مجید نے امت مسلمہ کی اس حیثیت کو بڑے واضح اور عظیم الشان انداز میں بیان فرمایا:

"كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" (آلِ عمران: 110)

ترجمہ: "تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے؛ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ امت کی "خیر" کا راز ہی اس کی دعوتی روح میں پوشیدہ ہے۔ اگر امت اس فرض سے غافل ہو جائے تو اس کی خیر بھی سلب ہو جاتی ہے، اور وہ محض ایک منتشر ہجوم بن کر رہ جاتی ہے۔

دعوت کی ذمہ داری صرف علماء، خطباء، یا مبلغین تک محدود نہیں۔ ہر مسلمان کو اپنے دائرۂ کار میں داعی ہے - والدین گھر میں، استاد درسگاہ میں، تاجر بازار میں، لکھاری قلم سے، اور طالب علم اپنے ہم نشینوں کے درمیان۔ یہ فرض ہر اس شخص پر عائد ہوتا ہے جو حق کو پہچان چکا ہو، اور جس کے دل میں انسانیت کا درد موجود ہو۔

دعوتِ دین کوئی ثانوی عمل نہیں بلکہ اسلام کی بنیادوں میں سے ہے۔ اگر نماز دین کا ستون ہے تو دعوت دین کا دروازہ ہے۔ اگر زکوٰۃ مال کی پاکی ہے تو دعوت دل کی مضبوطی ہے۔ اور جس طرح عبادات کے ترک پر باز پُرس ہو گی، اسی طرح دعوت کے ترک پر بھی سوال ہو گا۔

امت کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اُسے گواہ بنایا ہے - گواہ اپنے رب کے پیغام پر، گواہ انسانوں کے رویّوں پر، اور گواہ اس حقیقت پر کہ حق ان تک پہنچایا گیا۔

"وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا، لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ"

(البقرۃ:143)

یہ امت جب اس فرض کو ادا کرتی ہے تو وہ زمین پر اللہ کی حجت بن جاتی ہے، اور جب اس سے غفلت برتی ہے تو وہ خود اللہ کی حجت کے نیچے آ جاتی ہے۔

آج امت کے زوال، کمزوری، اور باطل کے غلبے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے دعوت کو چھوڑ دیا ہے، خاموشی کو ترجیح دی ہے، اور خیر کے پیغام کو دل میں دفن کر کے دنیا داری کی دوڑ میں لگ گئے ہیں۔ اگر امت اپنی عظمت کو پانا چاہتی ہے تو اُسے ایک بار پھر "دعوت" کو اپنے وجود کی اصل شناخت بنانا ہو گا۔

ترک دعوت کے نقصانات

دعوتِ دین نہ صرف امت کی ذمہ داری ہے بلکہ اس کی زندگی، حرارت اور بقاء کا راز بھی اسی فریضے کی ادائیگی میں پوشیدہ ہے۔ جب امتِ مسلمہ دعوت کو اپنی اولین ترجیح بناتی ہے تو وہ زمین پر خیر، عدل، ہدایت اور رحمت کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ لیکن جب یہی

امت دعوت سے غافل ہو جائے، اپنے دائرے میں بند ہو جائے، اور دین کو صرف ذاتی نجات کا ذریعہ سمجھے، تو پھر زوال، انتشار اور ذلت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

قرآن مجید ہمیں پچھلی اقوام کی تاریخ کے آئینے میں دعوت کے ترک کے تباہ کن نتائج دکھاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر اللہ کی لعنت کیوں نازل ہوئی؟
"كَانُوا لاَ يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ" (المائدہ:79)
یعنی "وہ ایک دوسرے کو برائی سے نہیں روکتے تھے جو وہ کرتے تھے۔"

یہ ایک واضح تنبیہ ہے: جب ایک قوم خیر کی نمائندہ ہو کر بھی برائی کے خلاف آواز نہ اٹھائے، نیکی کی طرف نہ بلائے، اور فتنوں کے خلاف خاموش تماشائی بن جائے، تو اللہ کی نصرت اس سے ہٹ جاتی ہے اور ذلت اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔

امتِ مسلمہ کا حال بھی کچھ مختلف نہیں۔ جب تک اس کے افراد دین کے داعی تھے، اس وقت تک دنیا نے ان کے قدموں کو چوما، مگر جب انہوں نے دین کی دعوت کو چھوڑ کر صرف دنیا کی دوڑ میں حصہ لینا شروع کیا، جب وہ اپنے گھر، اپنی عبادت، اپنی ذات تک محدود ہو گئے، تو باطل نے میدان سنبھال لیا اور حق کے علمبردار پسِ دیوار چلے گئے۔

دعوت کے ترک کا سب سے پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں حق و باطل کی تمیز مٹنے لگتی ہے۔ برائی عام ہونے لگتی ہے، نیکی اجنبی بن جاتی ہے، اور گناہ ایک معمول کی چیز سمجھا جانے لگتا ہے۔ جب نیکی کی دعوت دینے والا نہ ہو تو شیطان کی دعوت کھل کر سامنے آتی ہے، اور انسان کو اس کی فطرت سے کاٹ کر حیوانیت کی طرف دھکیلتی ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ خود داعی خاموشی کے سبب اپنی روحانیت سے محروم ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ دعوت، دراصل ایک روحانی زندگی ہے۔ جب انسان دوسروں کے لیے خیر چاہتا ہے، جب وہ کسی کے دل میں اللہ کا نام بسانا چاہتا ہے، تو خود اس کا دل بھی منور ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ جذبہ مر جائے تو ایمان بھی پژمردہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا نقصان امت کے اجتماعی وجود پر پڑتا ہے۔ امت کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ انسانیت کو رب سے جوڑنے کا ذریعہ بنے۔ جب وہ اس مقصد سے منہ موڑتی ہے تو دنیا میں اس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ قوم جو ہدایت کی علمبردار تھی، اب خود بھٹکنے لگتی ہے۔ نہ باطن میں روشنی، نہ ظاہر میں کشش۔

پس، دعوت کا ترک نہ صرف انفرادی طور پر ایمان کو کمزور کرتا ہے بلکہ اجتماعی طور پر امت کو اس کے اصل مقام سے گرا دیتا ہے۔ یہ غفلت صرف دنیا میں محرومی کا سبب نہیں، بلکہ آخرت میں بھی اللہ کے سامنے ایک بھاری جوابدہی کی شکل اختیار کرتی ہے۔

اسی لیے ضرورت ہے کہ امت خود کو دوبارہ دعوت کی راہ پر گامزن کرے، تاکہ وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو واپس حاصل کر سکے، اور وہ مشعلِ ہدایت بن سکے جس کے ذریعے انسانیت کا اندھیرا دور ہو۔

آج کے دور میں دعوت کی اشد ضرورت

اگر کسی حساس دل اور صاحبِ بصیرت نگاہ سے آج کی دنیا کا جائزہ لیا جائے تو ہر طرف ایک بے سمتی، اضطراب، اور فکری انتشار کی کیفیت نظر آتی ہے۔ انسان نے چاند اور ستاروں پر تو کمندیں ڈال دی ہیں، لیکن اپنی روح کی پیاس کا علاج نہیں ڈھونڈ سکا۔ ترقی کی

رفتار نے جسم کو سہولت دی مگر دل کو سکون نہیں دیا۔ معلومات کا طوفان برپا ہے مگر ہدایت کا چراغ بجھتا جا رہا ہے۔ ایسے عالم میں اگر کوئی پیغام انسانیت کو نجات کی طرف لے جا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف دعوتِ دین ہے۔

آج کا دور مادّہ پرستی، انفرادیت، بے راہ روی، جنسی بے حیائی، خاندانی نظام کے انہدام، اور روحانی خلا کا دور ہے۔ انسان ہر سطح پر ٹوٹ رہا ہے، بکھر رہا ہے، اور گم ہو رہا ہے۔ جدید تعلیم، میڈیا، سوشل نیٹ ورکس اور نظریاتی یلغار نے نئی نسل کو ان اقدار سے کاٹ دیا ہے جو کبھی اس کی روح کی غذا تھیں۔ اسلام سے وابستگی، قرآن سے محبت، اور سنت سے تعلق - یہ سب معدوم ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں دعوتِ دین محض ایک عبادت نہیں بلکہ ایک لازمی فریضہ اور فوری ضرورت بن چکی ہے۔

دعوت آج اس لیے ضروری ہے کہ نئی نسل سوالات کے طوفان میں ہے، شکوک و شبہات کے گرداب میں ہے، اور انہیں مطمئن کرنے والا نہیں۔ اگر ہم نے انہیں محبت، فہم، حکمت، اور استدلال سے دین کی حقیقت سے آشنا نہ کیا، تو وہ دوسروں کے فریب میں آ کر گمراہی کے راستوں پر چل پڑیں گے۔

دعوت اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ دنیا اسلام کے بارے میں بدگمانیوں، پروپیگنڈے اور غلط تصورات سے بھری ہوئی ہے۔ اسلاموفوبیا صرف مغرب میں نہیں، ہمارے اپنے تعلیمی نظاموں، میڈیا، اور ذہنوں میں بھی سرایت کر چکا ہے۔ اگر ہم نے اسلام کا اصل چہرہ نہ دکھایا، تو جھوٹ کے پردے حقیقت پر غالب آ جائیں گے۔

اور دعوت آج اس لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ امت مسلمہ خود بے سمتی کا شکار ہے۔ عقائد کمزور، عبادات رسمی، اور اخلاقیات زوال پذیر ہیں۔ دعوت کا کام نہ صرف دوسروں کے لیے، بلکہ خود امت کی اصلاح، تجدید، اور بیداری کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ یہ دعوت ہی ہے جو مایوس دلوں کو امید دیتی ہے، گمراہ ذہنوں کو راہ دکھاتی ہے، اور بکھرے وجود کو ایک مقصد سے جوڑتی ہے۔

پس، آج کا دور "دعوت کا دور" ہے - ایک ایسی آواز کی ضرورت ہے جو شور کے درمیان بھی سنی جا سکے، ایک ایسی روشنی جو اندھوں کو بصیرت دے، اور ایک ایسا داعی جو خود چلتا پھرتا پیغام بن جائے۔ اگر امت اس فرض کو آج ادا نہ کرے تو آنے والے کل کی نسلیں شاید ہمیں کبھی معاف نہ کر سکیں - اور قیامت میں رب تو یقیناً پوچھے گا۔

غیر مسلموں اور مسلمانوں تک دین پہنچانے کی اہمیت

دعوتِ دین کی وسعت صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اصل جوہر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب یہ پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔ اسلام کسی خاص نسل، قوم یا زبان کا دین نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے نازل کیا گیا آفاقی پیغام ہ

ے۔ قرآن مجید میں واضح ارشاد ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلاَّ كَافَّةً لِّلنَّاسِ"(سبأ:28)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے ہی بھیجا ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا دائرہ پوری انسانیت پر محیط تھا۔ آپ نے عرب قبائل کو، یہود و نصاریٰ کو، بادشاہوں اور حکمرانوں کو، اور عام لوگوں کو یکساں طور پر اسلام کی طرف بلایا۔ آپ کی رحمت صرف اہلِ ایمان تک محدود نہ تھی، بلکہ آپ تو "رحمۃ للعالمین" بن کر آئے تھے۔ یہی دعوتی روح امت کو ورثے میں ملی ہے، اور یہ ورثہ صرف اپنی قوم، اپنے فرقے یا اپنے دائرے تک محدود کر دینا اس امانت سے خیانت کے مترادف ہے۔

آج دنیا کے کروڑوں غیر مسلم اسلام سے ناواقف ہیں، یا اسلام کے بارے میں منفی تصورات رکھتے ہیں۔ ان کے دل سچ کی تلاش میں بے چین ہیں، لیکن کوئی ایسا نہیں جو نرمی، حکمت اور محبت سے ان تک دین کا اصل چہرہ پہنچائے۔ اگر ہم نے یہ ذمہ داری نہ نبھائی تو یہ قیمتی روحیں ہمارے سُستی اور غفلت کے باعث گمراہی کی نذر ہو جائیں گی۔ دعوت کا کام دراصل ان دلوں پر دستک دینا ہے جو نورِ ہدایت کے منتظر ہیں۔

اسی طرح خود مسلمان جو دین سے دور ہو چکے ہیں، جن کی زندگیاں رسموں، بدعات، غفلتوں اور دنیا پرستی میں ڈوب چکی ہیں، وہ بھی ہماری دعوت کے محتاج ہیں۔ وہ جو مسلمان کہلاتے ہیں مگر قرآن کو نہیں پڑھتے، نماز سے غافل ہیں، یا عقیدے کی بنیادوں سے ناواقف ہیں - ان کے پاس پہنچنا، ان سے محبت، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ بات کرنا، اور انہیں دین کی طرف پلٹنے کی ترغیب دینا بھی دعوت کا ایک اہم ترین پہلو ہے۔

یہی لوگ اگر صحیح علم، اچھا رویہ، نرمی بھرا لہجہ، اور مخلص دعوت پائیں تو نہ صرف خود سنور سکتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی باعثِ ہدایت بن سکتے ہیں۔ ہمیں اس تصور کو ختم کرنا ہو گا کہ دعوت صرف "غیر مسلموں" کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا

بہت مسلمان بھی ایک گمشدہ مسافر ہے، جسے راہ دکھانے کی ضرورت ہے - اور یہ راہ صرف ایک سچے داعی ہی دکھا سکتا ہے۔

اس لیے دعوت نہ صرف ایک عالمی فریضہ ہے بلکہ ایک اندرونی اصلاحی جدوجہد بھی ہے۔ جب ہم غیر مسلموں کے دلوں پر دستک دیتے ہیں تو دراصل ہم انسانیت کے حق میں بولتے ہیں، اور جب ہم اپنے بھٹکے ہوئے بھائیوں کو واپس دین کی طرف بلاتے ہیں تو امت کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں۔ یہی وہ عمل ہے جس سے امت کا جسم بھی جڑے گا، روح بھی جگے گی، اور انسانیت بھی ہدایت پائے گی۔



باب دوم: دعوت کے مؤثر طریقے اور حکمتیں



حکمت اور نرمی

دعوتِ دین کا راستہ، دلوں کو فتح کرنے کا راستہ ہے، اور دل وہ بستی ہے جو زور سے نہیں جیتی جاتی، نرمی سے کھولی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں دعوت کا حکم دیا گیا، وہیں اس کا اسلوب بھی واضح طور پر بیان کیا گیا۔ فرمایا:

"ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ"(النحل:125)

ترجمہ: "اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔"

دعوت اگر حکمت سے خالی ہو جائے تو وہ محض نعرہ بن کر رہ جاتی ہے، اور اگر نرمی سے خالی ہو جائے تو وہ دل کو چیرنے کے بجائے زخمی کر دیتی ہے۔ حکمت، بات کو درست وقت، درست جگہ، اور درست انداز سے کہنے کا نام ہے۔ نرمی، وہ لہجہ ہے جو مخاطب کے دل کو ٹھیس نہ پہنچائے بلکہ اس کی روح پر دستک دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی حکمت اور نرمی کی عملی تفسیر ہے۔ آپ نے عرب جیسے جاہل، ضدی اور کٹھن دل رکھنے والے لوگوں کو نرم زبان، پیار بھرے لہجے اور بصیرت افروز حکمت سے بدل دیا۔ طائف کے پتھر کھانے کے بعد بھی جب فرشتہ اجازت مانگتا ہے کہ ان پر پہاڑ الٹ دوں؟ تو آپ فرماتے ہیں:

"نہیں، شاید ان کی نسل سے وہ لوگ پیدا ہوں جو ایک اللہ کی عبادت کریں گے۔"

یہ نرمی صرف اخلاق نہیں، بلکہ حکمت کی معراج ہے - وہ حکمت جو وقتی ردِ عمل پر نہیں، دوررس نتائج پر نظر رکھتی ہے۔

قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جب فرعون جیسے ظالم کے پاس بھیجا تو فرمایا:

"فَقُولاَ لَهُ قَوْلاً لَّيِّنًا" (طٰہٰ:44)

ترجمہ: "اس سے نرمی سے بات کرنا۔"
یہ اسلوبِ دعوت کی سب سے حسین ہدایت ہے کہ دشمنِ خدا کے سامنے بھی سخت لہجہ اختیار نہ کرو، تاکہ اس کے دل میں کچھ اثر پیدا ہو۔

آج کے دور میں جب دل پہلے ہی شکوک، غصے، نفرت، اور فکری انتشار سے لبریز ہیں، تو دعوت کا انداز اور زیادہ نرمی، تحمل اور حکمت کا محتاج ہے۔ بعض داعی سچ تو کہتے ہیں، مگر اس انداز میں کہ سچ کڑوا نہیں بلکہ زہر بن جاتا ہے۔ یہ دین کا پیغام ہے، اسے محبت کے ساتھ، خوشبو کی طرح پھیلانے کی ضرورت ہے، نہ کہ گولی کی طرح داغنے کی۔

حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر شخص سے اس کی سطح پر بات کی جائے۔ جاہل سے اس کے فہم کے مطابق، عالم سے اس کی زبان میں، متکبر سے عزت بچاتے ہوئے، اور شاکی سے ہمدردی جتاتے ہوئے۔ نرمی یہ ہے کہ ہم سننے سے پہلے بولیں نہیں، سمجھنے سے پہلے رد نہ کریں، اور اصلاح سے پہلے رشتہ قائم کریں۔

یہی وہ اسلوب ہے جس سے دعوت زندہ رہتی ہے، دل متاثر ہوتے ہیں، اور انسان اپنے رب کی طرف لوٹنے لگتا ہے۔ جس دعوت میں حکمت ہو، وہ عقل کو قائل کرتی ہے، اور جس میں نرمی ہو، وہ دل کو مائل کرتی ہے - اور دعوت تب ہی مکمل ہوتی ہے جب عقل اور دل دونوں اللہ کے حضور جھک جائیں۔

قولِ حسن اور بہترین طرزِ بیان

دعوت کا اثر صرف اس بات پر نہیں ہوتا کہ کیا کہا جا رہا ہے، بلکہ اس پر بھی ہوتا ہے کہ کیسے کہا جا رہا ہے۔ الفاظ، جیسے کہ تیر ہوتے ہیں، لیکن ان کی نوک نرم ہو تو وہ دل کو زخمی کرنے کے بجائے نرم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے نہ صرف دعوت کی تلقین کی، بلکہ اس کے لب و لہجے اور اندازِ گفتگو پر بھی زور دیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

" وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا"(البقرہ:83)

ترجمہ:"اور لوگوں سے بھلی بات کہا کرو۔"

یہ آیت کسی خاص قوم یا طبقے کے بارے میں نہیں، بلکہ "تمام لوگوں" کے بارے میں ہے۔ اس میں ایک داعی کے لیے اصول بیان کر دیا گیا کہ اس کی گفتگو نرم، شیریں، اور بھلی ہونی چاہیے، کیونکہ زبان کی شیرینی وہ کنجی ہے جو بند دلوں کو بھی کھول سکتی ہے۔

قولِ حسن صرف خوش لفظی نہیں، بلکہ دل کی خیر خواہی کا عکس ہوتا ہے۔ جب انسان سچ کو محبت کے ساتھ پیش کرتا ہے، احترام سے بات کرتا ہے، اور مخاطب کی عزتِ نفس کا خیال رکھتا ہے، تو یہ اس کے کلام میں حسن پیدا کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب یہی تھا- آپ کی بات میں نہ طنز ہوتا، نہ سختی، نہ تحقیر، بلکہ وقار، شفقت اور تاثیر کا امتزاج ہوتا۔

دعوت کا پیغام کتنا بھی سچا ہو، اگر اس کی پیشکش میں درشتی ہو، تضحیک ہو یا جھڑ کاہٹ ہو، تو وہ اثر انداز ہونے کے بجائے دلوں کو بند کر دیتا ہے۔ انسان کبھی صرف دلیل سے

قائل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس بات سے متاثر ہوتا ہے کہ بات کرنے والا اس سے کس نیت سے، کس لہجے میں، اور کس خلوص سے مخاطب ہے۔

بہترین طرزِ بیان وہی ہوتا ہے جو بات کو مختصر، مگر جامع انداز میں پیش کرے۔ نہ ضرورت سے زیادہ الجھا دے، نہ اتنا سادہ ہو کہ بات کی گہرائی ضائع ہو جائے۔ دعوت کے میدان میں ہر لفظ بولا نہیں جاتا، تولا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک جملہ کسی کے دل میں اللہ کی طرف لوٹنے کا دروازہ کھول دیتا ہے، اور بعض اوقات ایک تلخ لفظ سچائی سے ہمیشہ کے لیے متنفر کر دیتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الكلمة الطيبة صدقة" (صحیح بخاری)

ترجمہ: "بھلی بات صدقہ ہے۔"

یہ حدیث صرف عمومی اخلاقیات کی تعلیم نہیں دے رہی، بلکہ دعوت کے میدان میں ایک اصول پیش کر رہی ہے- کہ جو بات بھلی ہو، نرم ہو، مقصد پر مبنی ہو، اور دل میں اُتر جائے، وہ خود ایک صدقہ ہے۔

لہٰذا، قولِ حسن اور بہترین طرزِ بیان کسی داعی کا محض ہنر نہیں بلکہ اس کا ہتھیار ہے۔ یہی دلوں کو متاثر کرنے کی قوت ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جس سے ہدایت کے چراغ جلائے جا سکتے ہیں- خاموشی سے، محبت سے، اور عزت کے ساتھ۔

کردار سے دعوت

دعوتِ دین کی سب سے پُراثر اور دیرپا صورت وہ ہے جو زبان کے بجائے کردار سے دی جائے۔ کیونکہ زبان سے کہی گئی بات کبھی ذہن میں رہ جاتی ہے، مگر کردار سے دی گئی دعوت دل کے اندر اُتر جاتی ہے، اور برسوں بعد بھی اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی دعوت محض الفاظ پر نہیں تھی، بلکہ ان کے کردار، صداقت، امانت، حلم، دیانت اور شفقت سے لوگوں کے دل بدل گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی کامیابی کے پیچھے سب سے بڑی قوت آپ کا بے داغ اور روشن کردار تھا۔ قبل از بعثت ہی لوگ آپ کو "الصادق" اور "الأمین" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ دعوت کے آغاز میں بھی کفارِ مکہ کو آپ کے کردار پر اعتراض نہیں تھا، بلکہ وہ اس کردار کی طاقت سے خائف تھے کہ یہ انسان اگر کچھ کہہ رہا ہے تو سچ ہی کہہ رہا ہوگا۔ یہی کردار تھا جو بغیر زبان کے بھی دعوت دیتا تھا، اور یہی کردار آج بھی سب سے بڑی دعوت بن سکتا ہے۔

کردار کی دعوت وہ دعوت ہے جس میں داعی خود دعوت کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتا ہے۔ جب ایک مسلمان سچ بولے، وعدہ نبھائے، امانت داری سے معاملہ کرے، نرم مزاج ہو، معاف کر دینا اس کی عادت ہو، تو اس کا یہ رویہ خود اعلانِ دعوت ہوتا ہے۔ ایسا شخص زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کی شخصیت لوگوں کو دین کی طرف کھینچتی ہے۔

آج کا انسان الفاظ سے تھک چکا ہے۔ تقریریں، پوسٹرز، دلائل - سب کچھ اُس نے سن اور دیکھ لیا ہے، مگر جو چیز اسے متاثر کرتی ہے وہ عمل ہے۔ ایک صابر شوہر، ایک مہربان استاد، ایک دیانت دار تاجر، ایک سچا دوست - جب وہ دین کی بات کرتا ہے تو اس کی بات میں روح ہوتی ہے، زندگی ہوتی ہے، اثر ہوتا ہے۔

دعوت کا یہ پہلو نہ صرف غیر مسلموں کے لیے اہم ہے بلکہ خود مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ بچے والدین کے کردار سے متاثر ہوتے ہیں، طلبہ اساتذہ کے رویّے سے سیکھتے ہیں، ملازمین سربراہ کی دیانت سے بدلتے ہیں۔ اگر ہم اپنے دائرے میں کردار کے ذریعے دین کی نمائندگی کریں تو یہ معاشرہ خاموش انقلابات سے بدل سکتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کردار کی دعوت سب سے زیادہ محنت، اخلاص اور صبر مانگتی ہے۔ اس میں دکھاوا نہیں چلتا، صرف حقیقت بولتی ہے۔ اس کے اثرات آہستہ ظاہر ہوتے ہیں، مگر دیرپا ہوتے ہیں۔ ایک سچا داعی اگر اپنی شخصیت کو دعوت بنا لے تو وہ خود ایک زندہ دلیل بن جاتا ہے - ایسی دلیل جو کسی کتاب میں نہیں ملتی، مگر دلوں کو ہدایت کی راہ دکھا دیتی ہے۔

حالات کے مطابق دعوت

دعوتِ دین کوئی جامد عمل نہیں، بلکہ یہ ایک زندہ، بیدار اور حساس فریضہ ہے۔ جیسے انسان کے حالات، ذہنی سطح، اور جذبات بدلتے رہتے ہیں، ویسے ہی دعوت کے اسلوب، انداز اور زبان میں بھی حکمت کے ساتھ تبدیلی اور نرمی ہونی چاہیے۔ ایک داعی کا دل محض پیغام سنانے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک طبیب کی طرح ہوتا ہے، جو ہر مریض کے مزاج، مرض اور حالت کو دیکھ کر دوا تجویز کرتا ہے۔

قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا:

"فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ" (الأعلى: 9)

ترجمہ: "پس نصیحت کرو، اگر نصیحت فائدہ دے۔"
یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ دعوت بے محل نہ ہو، مخاطب کی کیفیت، سننے کی آمادگی، اور اس کے حالات کو سمجھ کر کی جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو آپ ہر فرد سے، ہر موقع پر، اس کے ظرف، عقل اور حالات کے مطابق گفتگو فرماتے۔ ایک بدو سے سادہ الفاظ میں، ایک دانا سے دلیل و حکمت کے ساتھ، اور ایک معترض سے نرمی اور بردباری سے۔ آپ نہ سب کو ایک ہی سانچے میں ڈھالتے، نہ ایک ہی انداز سب پر آزمانے کی کوشش کرتے۔ یہی وہ حکمت ہے جس نے آپ کی دعوت کو دلوں میں اُتار دیا۔

آج کے دور میں یہ بات اور زیادہ اہم ہو چکی ہے، کیونکہ دنیا ایک عالمگیر گاؤں بن چکی ہے۔ مختلف طبقات، نظریات، زبانیں، اور فکری رجحانات رکھنے والے انسانوں کو ایک ہی انداز سے مخاطب کرنا نہ صرف غیر مؤثر ہے، بلکہ بعض اوقات ردِ عمل کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ ایک طالب علم کو دلیل کی ضرورت ہے، ایک جذباتی شخص کو محبت کی، ایک گناہگار کو امید کی، اور ایک مغرور کو حکمت سے جھنجھوڑنے کی۔

اسی طرح دعوت کے وقت اور مقام کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات گفتگو کی بات بعد میں کی جائے، پہلے رشتہ، اعتماد، اور قربت پیدا کی جائے۔ کسی مجلس میں دعوت کا موقع ہو تو انداز مہذب اور مختصر ہو، اور کسی انفرادی ملاقات میں بات گہرائی سے کی جائے۔ حکمت یہ ہے کہ دعوت اثر چھوڑے، ضد نہ پیدا کرے؛ دل کھولے، دروازے بند نہ کرے۔

آج میڈیا کا دور ہے، سوشل نیٹ ورک، ویڈیوز، کتابیں، اور آوازیں ہر طرف ہیں- ایسے میں داعی کا فرض اور زیادہ سنگین ہے۔ وہ ہر اسلوب، ہر زبان، اور ہر ذریعہ کو پہچانے، مگر اصل پیغام کو محفوظ رکھتے ہوئے انداز کو بدلنے کی صلاحیت رکھے۔ کیونکہ بات وہی مؤثر ہوتی ہے جو دل کے موسم کے مطابق ہو۔

الغرض، دعوت ایک حساس فن ہے، جو وقت، مزاج، زبان، ماحول اور مخاطب کی کیفیت سے جُڑا ہوا ہے۔ جو داعی ان حالات کو سمجھ کر بات کرتا ہے، وہ لوگوں کے دل میں جگہ پاتا ہے؛ اور جو محض اپنی بات کہنے پر مصر ہوتا ہے، وہ کبھی سامع کے دل کو چھو نہیں پاتا۔

دعوت کے مختلف میدان

دعوتِ دین ایک جامع عمل ہے جو زندگی کے ہر گوشے میں سرایت کرتا ہے۔ یہ محض خطبوں، کتابوں، یا دروس تک محدود نہیں بلکہ ہر وہ مقام جہاں انسان موجود ہے، دعوت کا میدان بن سکتا ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو صرف مسجد تک محدود نہیں بلکہ گھر، بازار، اسکول، دفتر، میڈیا، اور معاشرے کے ہر طبقے تک رسائی چاہتا ہے۔ اسی لیے ایک سچا داعی اپنے دائرۂ عمل کو محدود نہیں رکھتا، بلکہ اپنی صلاحیت، وقت اور وسائل کے مطابق ہر میدان میں دعوت کا چراغ روشن کرتا ہے۔

ا۔ فردی دعوت (انفرادی ملاقاتیں

یہ دعوت کا سب سے مؤثر اور قریبی میدان ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کے ساتھ بیٹھ کر، خلوص، خیر خواہی، اور محبت کے ساتھ دین کی بات کرتا ہے،

تو اس کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ فردی ملاقات میں داعی مخاطب کے مزاج، سوالات اور کیفیت کو سمجھ کر بات کر سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی صحابہ کرام کو انفرادی طور پر مخاطب کر کے ان کے دل میں اسلام کی روشنی ڈالی۔

اجتماعی دعوت (خطبے، دروس، اجتماعات)

یہ میدان عوامی سطح پر پیغام پہنچانے کا طاقتور ذریعہ ہے۔ خطباء، مقررین، اساتذہ اور دینی رہنما عوام کو ایک بڑے دائرے میں دین کی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میدان میں داعی کو حکمت، زبان و بیان، وقت کی رعایت، اور مخاطبین کی سطح کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے تاکہ پیغام صرف آواز نہ بنے، بلکہ فکر بھی پیدا کرے۔

دعوتِ تحریر (کتب، مضامین، پمفلٹ، پیغامات)

تحریر وہ ذریعہ ہے جو دور تک جاتا ہے، بار بار پڑھا جا سکتا ہے، اور خاموشی سے دل و دماغ میں اثر چھوڑتا ہے۔ دینی کتب، مختصر رسائل، دعوتی پمفلٹ، سوشل میڈیا پوسٹس، اور تعلیمی نصاب - یہ سب دعوت کے مضبوط میدان ہیں۔ جو لوگ زبان سے بات نہیں کر سکتے، وہ قلم سے بڑے داعی بن سکتے ہیں۔

۴۔ دعوت بذریعہ کردار و عمل:

یہ وہ خاموش دعوت ہے جو ہر مسلمان کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن سکتی ہے۔ ایک ایماندار تاجر، ایک صابر پڑوسی، ایک نرمی سے بولنے والا سرکاری ملازم، یا ایک مشفق و مخلص استاد - جب وہ اپنے عمل سے دین کی خوبیاں دکھاتا ہے تو یہی اس کا دعوتی پیغام بن جاتا ہے۔ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد اسی کردار کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لائی۔

دعوتِ خانگی (گھر کے اندر دعوت)

گھر سب سے پہلا مدرسہ ہے، اور والدین سب سے پہلے داعی۔ اولاد، بہن بھائی، شریکِ حیات - یہ سب انسان کے قریب ترین حلقے ہوتے ہیں، اور ان تک دین کا پیغام نرمی، محبت اور حکمت سے پہنچانا سب سے ضروری اور مؤثر میدان ہے۔ اگر گھر کی فضا دین سے منور ہو جائے تو پوری نسل سنور سکتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں دعوت

اسکول، کالج، اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے اور پڑھانے والے افراد کے لیے یہ ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں نئی نسل کی فکری تعمیر کی جاتی ہے۔ داعی اس ماحول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاق، عقیدہ، اور سیرتِ نبوی کی تعلیمات دے سکتا ہے۔ صرف ایک استاد کی نرمی، فہم و فراست اور فکر دعوت کا دروازہ کھول سکتی ہے۔

میڈیا اور سوشل میڈیا

یہ زمانہ ابلاغ کا ہے، اور میڈیا اس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ ایک ویڈیو، ایک کلپ، ایک تحریر لاکھوں لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر اس میدان میں اہلِ حق، حکمت، بصیرت، اور دین کا فہم رکھنے والے افراد داخل نہ ہوں گے تو باطل اپنا رنگ جماتا رہے گا۔ آج کا داعی اس میڈیا کو دعوت کا میدان سمجھے اور اسے حکمت سے استعمال کرے۔

الغرض، دعوت کا میدان صرف مسجد، منبر، یا مدرسہ نہیں- بلکہ ہر وہ جگہ جہاں انسان موجود ہے، دعوت کی ممکنہ سرزمین ہے۔ دعوت کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تبسم، ایک خوش اخلاقی، ایک نرم جملہ بھی دعوت بن سکتا ہے، اور ایک اچھی نیت سے اٹھایا گیا ہر قدم دعوت کا حصہ بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس شعور کی ہے کہ ہم اپنے ہر عمل کو دین کا آئینہ بنا دیں، اور اپنے وجود کو دعوت کا پیکر۔

جدید دور میں دعوت کے چیلنجز اور ان کا حل

ہر دور کی دعوت اپنے دور کے تقاضوں، فکری چیلنجز، اور معاشرتی رویوں کے مطابق اپنی شکل اختیار کرتی ہے۔ موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ظاہری ترقی، علمی وسعت، اور ابلاغی وسائل کی بہتات کے باوجود انسان اپنے مقصدِ زندگی، روحانی سکون، اور اخلاقی بلندی سے کٹ چکا ہے۔ ایسے میں دعوتِ دین کی ذمہ داری اور بھی نازک اور وسیع ہو جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ راستے میں رکاوٹیں بھی کثرت سے سامنے آتی ہیں۔

۱۔ فکری و نظریاتی انتشار:

جدید دور میں انسان کو ایسے افکار و نظریات کا سامنا ہے جو مذہب کو نجی معاملہ، وحی کو قصہ، اور وحی لانے والے نبی کو ایک عام مصلح سمجھتے ہیں۔ الحاد (Atheism)، مادّیت (Materialism)، سائنس پرستی (Scientism)، لبرل ازم (Liberalism)، اور سیکولرازم (Secularism) نے انسانی ذہن کو ایسے

جال میں جکڑ لیا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں۔ دین کو دلیل کے بجائے جذبات یا جبر کی چیز سمجھا جانے لگا ہے۔

حل:

دعوت کو تحکم یا صرف جزباتی انداز سے پیش کرنے کے بجائے، عقلی استدلال، تاریخی شواہد، اور فکری انداز میں بھی پیش کرند ہو گا۔ نوجوان نسل کو وہ اسلام دکھانا ہو گا جو عقل کی روشنی میں بھی قائم ہے، فطرت سے ہم آہنگ بھی، اور روح کی غذا بھی۔

۲۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کا منفی استعمال:

میڈیا آج سب سے طاقتور ذریعہ ہے - جو جھوٹ کو سچ، فحاشی کو آزادی، اور ظلم کو انصاف کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ سوشل میڈیا نے جہاں دعوت کا دروازہ کھولا ہے، وہیں فتنوں کا سیلاب بھی برپا کر دیا ہے۔

حل:

دعوت کا پیغام انہی ذرائع کے ذریعے عام کرنا ہو گا، مگر ایک نئ حکمت، عمدہ زبان، دل نشین انداز، اور بصیرت سے۔ سوشل میڈیا کو ایک دعوتی ہتھیار بنایا جائے - جہاں چھوٹے ویڈیوز، مختصر تحریریں، تصاویر، اور بات چیت کے انداز سے لوگ متاثر ہوں۔ مگر اس کام کے لیے اہل علم و بصیرت، تربیت یافتہ داعیوں کی تیاری ناگزیر ہے۔ سوشل میڈیا ایک نیٹورک کے ذریعہ کام کرتا ہے تو داعیان اسلام کو چاھئے کہ وہ سوشل میڈیا پر کام کرنے والے داعیان کو سپورٹ کریں تاکہ لوگوں تک مؤثر طریقہ سے پہونچے۔

۳۔ نوجوان نسل کا مذہب سے فاصلہ:

تعلیم یافتہ نوجوان آج اسلام کو اپنے سوالوں کے جواب سے خالی، اور جدید زندگی کے تقاضوں سے بے تعلق محسوس کرتے ہیں۔ مذہب کو محض جذبات یا عبادات تک محدود سمجھتے ہیں۔

حل:

نوجوانوں کے ساتھ مکالمے، سوال و جواب، علمی نشستوں، اور تربیتی پروگراموں کا آغاز کیا جائے جہاں انہیں سنجیدگی، عزت اور فہم کے ساتھ دین سے جوڑا جائے۔ تعلیمی اداروں میں دین کے نمائندہ افراد موجود ہوں، جو جدید ذہن کے سوالات کو احترام سے سنیں اور علم سے جواب دیں۔

۴۔ مسلمانوں میں دعوتی شعور کا فقدان:

امت کا بڑا طبقہ دعوت کو صرف علما یا مبلغین کا کام سمجھتا ہے۔ عام مسلمان دعوت کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا، اور نہ اپنے دائرے میں کوئی کوشش کرتا ہے۔

حل:

مساجد، مدارس، تعلیمی ادارے، خطباتِ جمعہ اور اصلاحی نشستوں میں دعوت کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ عام مسلمان کو یہ سمجھایا جائے کہ اُس کا رویہ، کردار، زبان، اور اخلاق بھی دعوت ہے۔ ہر فرد کو ایک داعی بننے کا تصور دیا جائے اور ان کے تربیتی پروگرام کا انعقاد کیا جائے۔

۵۔ باہمی فرقہ واریت اور مسلکی تعصب:

جب خود مسلمان ایسے معاملات میں جہاں اسلام نے خود اختلاف کی گنجائش رکھی ہے وہاں بھی ایک دوسرے کو کافر، گمراہ، یا بدعتی کہنے میں مصروف ہوں تو دین کا پیغام غیر مسلم تک کیسے پہنچے گا؟ فرقہ واریت دعوت کے حسن کو مجروح کرتی ہے۔

حل:

دعوت کے میدان میں وہ امور پیش کیے جائیں جو تمام مسلمانوں کے درمیان مشترک ہوں۔ توحید، رسالت، اخلاق، قرآن کی دعوت، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ اختلافی موضوعات کو دعوت کے میدان میں چھیڑنے سے گریز کیا جائے، اور اتحادِ امت کی فضا کو فروغ دیا جائے۔

غیر مسلموں سے گفتگو کے آداب اور اسلوب

اسلام تمام انسانوں کا دین ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے ہادی ور ہبر بنا کر بھیجے گئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلاَّ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ"(الأنبياء:107)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔"

اسی رحمت کے زیرِ اثر ایک داعی کو بھی غیر مسلموں سے گفتگو کرتے وقت انتہائی شفقت، حلم، نرمی، اور حکمت سے کام لینا چاہیے۔ ان کے ساتھ گفتگو کا مقصد مقابلہ یا

مغلوب کرنا نہیں، بلکہ ان کے دلوں تک حق کی روشنی کو پہنچانا ہوتا ہے - اور یہ کام صرف زبان سے نہیں، بلکہ اخلاق و کردار سے بھی انجام پاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوبِ دعوت غیر مسلموں کے ساتھ بے حد مہذب، محبت بھرا اور دردمندی پر مبنی ہوتا تھا۔ چاہے وہ مکہ کے سردار ہوں یا طائف کے پتھر مارنے والے، آپ کا چہرہ غصے سے سرخ نہ ہوتا، بلکہ آنکھیں اشکبار ہوتیں اور زبان پر دعا ہوتی: "اللهم اهد قومي فإنهم لا يعلمون"۔ "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، وہ جانتے نہیں۔"

غیر مسلموں سے گفتگو کے چند بنیادی آداب یہ ہیں:

۱۔ نرمی اور عزت کے ساتھ کلام:
قرآن میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون جیسے ظالم کے سامنے بھی نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا گیا:
"فَقُولاَ لَهُ قَوْلاً لَّيِّنًا"(طہ:44)
تو وہ لوگ جو ابھی حق سے ناواقف ہیں، ان سے سختی کیسے روا رکھی جا سکتی ہے؟ سخت لہجہ دلوں کو بند کر دیتا ہے، جب کہ نرمی دل کی کنجی ہے۔

۲۔ حکمت اور عقل سے بات کرنا:
غیر مسلم مخاطب اکثر جذبات سے زیادہ عقل کی بنیاد پر سوال کرتا ہے۔ اس لیے داعی کو چاہیے کہ وہ قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ ساتھ فکری، اخلاقی اور عقلی بنیادوں پر بھی دین کی خوبصورتی واضح کرے۔

۳۔ تعصب سے پاک انداز:

گفتگو میں کبھی توہین، طنز یا تحقیر نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے معبود کا مذاق نہیں اُڑایا، بلکہ باوقار انداز میں توحید کی دعوت دی۔ قرآن بھی سکھاتا ہے:

"وَلاَ تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰہِ"(الأنعام:108)

ترجمہ: "اور ان کو برا نہ کہو جنہیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔"

۴۔ سامع کے عقائد، رسم و رواج، اور حساسیت کو جاننا:

دعوت کا مؤثر ہونا اس بات پر بھی منحصر ہے کہ داعی مخاطب کی تہذیبی و مذہبی فضا سے آگاہ ہو۔ بعض جملے، انداز یا الفاظ مخاطب کو بدظن کر سکتے ہیں۔ داعی کو نہ صرف زبان پر قابو رکھنا ہے بلکہ دل پر بھی؛ تاکہ وہ مخاطب کے احساسات کو مجروح نہ کرے۔

۵۔ سادہ، واضح اور پر اثر اندازِ بیان:

پیچیدہ گفتگو، فقہی اصطلاحات، اور اندرونی اختلافات کو دعوت میں شامل کرنا غیر ضروری ہوتا ہے۔ دعوت وہ ہوتی ہے جو دل کو لگے، آسان ہو، اور مخاطب کے لیے قابلِ فہم ہو۔

۶۔ سوالات سے گھبرانا نہیں، ہمدردی سے جواب دینا:

غیر مسلم اکثر سخت سوالات کرتے ہیں۔ داعی کو چاہیے کہ وہ سختی سے نہیں، بلکہ سکون اور تحقیق کے ساتھ جواب دے۔ "مجھے اس کا جواب معلوم نہیں، مگر میں تلاش کر کے بتاؤں گا"۔ یہ جملہ داعی کی کمزوری نہیں بلکہ صداقت کی علامت ہے۔

۷۔ دعا، خلوص اور نیت کی پاکیزگی:

آخری بات یہ ہے کہ دعوت کے اثر کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں بلکہ دل سے ہوتا ہے۔ اگر دل میں اخلاص ہو، آنکھوں میں درد ہو، اور زبان پر نرمی ہو تو اللہ ان الفاظ میں ایسی تاثیر ڈال دیتا ہے جو کتابیں بھی پیدا نہیں کر سکتیں۔

دعوتِ دین صرف "کلام" کا نام نہیں، یہ "کرم" کا تقاضا کرتی ہے۔ غیر مسلموں سے بات کرتے وقت داعی کا رویّہ ایسا ہو جیسے وہ ایک گمشدہ مسافر کو راستہ دکھا رہا ہو - سختی نہیں، ترس کے ساتھ؛ جبر نہیں، پیار کے ساتھ۔ یہی وہ دعوت ہے جو حضرت عمر، حمزہ، خالدؓ اور ان جیسے ہزاروں دیگر دلوں کو ایمان کی روشنی میں لائی۔ اور آج بھی یہی اسلوب دنیا بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔



باب سوم: داعی کے اوصاف



اخلاص اور للّٰہیت

دعوتِ دین کی بنیاد اگر کسی وصف پر قائم ہے تو وہ "اخلاص" ہے۔ یہ وہ روح ہے جو عمل کو زندہ کرتی ہے، نیت کو پاک کرتی ہے، اور دل کو اللہ کی رضا کے لیے مخصوص کر دیتی ہے۔ اگر دعوت میں اخلاص نہ ہو تو وہ ایک فن تو ہو سکتا ہے، ایک دلیل تو ہو سکتی ہے، ایک تقریر تو بن سکتی ہے۔ لیکن وہ دلوں کو بدلنے والی دعوت نہیں بن سکتی، جس سے انسان کی تقدیر بدل جائے اور زمین پر ہدایت کی روشنی پھیل جائے۔

اخلاص کا مطلب ہے کہ داعی اپنی دعوت، محنت، گفتگو، اور جدوجہد سے کسی دنیاوی مفاد، شہرت، تعریف یا غلبہ نہیں چاہتا، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا، اس کے دین کی سربلندی، اور انسانوں کی ہدایت کا طالب ہوتا ہے۔ یہی وہ نیت ہے جو عمل کو عبادت بناتی ہے، اور یہی وہ وصف ہے جو اللہ کے ہاں مقبولیت کا معیار ہے۔ اگر کوئی دعوت قبول کر کے روبہ کر لے یا اسلام میں داخل ہو جائے تو اسے خدا کا فضل سمجھے اور گھمنڈ و غرور میں مبتلا ہو کر لوگوں کو بتلاتا نہ پھرے کہ میں نے فلاں فلاں یا اتنے لوگوں کو حق کا راستہ دکھادیا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَمَا أُمِرُوا إِلاَّ لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ"(البیّنہ:5)

ترجمہ: "اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اخلاص کا درجہ اس قدر بلند تھا کہ آپ ہر عمل کو "لوجہ اللہ" انجام دیتے۔ طائف کے میدان میں پتھروں سے لہولہان ہونے کے بعد بھی جب دعا مانگی تو اس میں اپنی ذات کا نہیں، اللہ کی رضا کا ذکر تھا۔ یہ اخلاص ہی تھا جس نے آپ کی دعوت کو ایسی تاثیر بخشی کہ وہ دل جن میں پتھر تھے، وہ بھی موم بن گئے۔

ایک داعی جب اخلاص سے خالی ہو جاتا ہے، اور اس کا مقصد دنیاوی شہرت، لوگوں کی واہ واہ، یا گروہی غلبہ بن جاتا ہے تو اس کی دعوت ایک ظاہری نمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی دعوت بظاہر مؤثر لگتی ہے، مگر وہ دلوں میں نور پیدا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس، ایک مخلص داعی خواہ کم علم ہو، مگر اس کی بات دل سے نکلتی ہے، اور دل پر اثر کرتی ہے - کیونکہ اس کے پیچھے اللہ کے لیے محبت، سچائی، اور دردمندی ہوتی ہے۔

اخلاص وہ نعمت ہے جو ریا سے دور رکھتی ہے، فتنوں سے بچاتی ہے، اور عمل کو خالص بناتی ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو ایک داعی کو دنیا کی واہ واہ سے بے نیاز اور رب کی رضا کے لیے پُرجوش رکھتی ہے۔ یہی وہ للہیت ہے جو انسان کو ہر حال میں ثابت قدم رکھتی ہے، تنہائی میں بھی متحرک رکھتی ہے، اور مخالفتوں کے طوفان میں بھی قائم رکھتی ہے۔

دعوت کا اثر الفاظ میں نہیں، نیت میں ہوتا ہے۔ اگر داعی کا دل اللہ کی رضا کا طلبگار ہے، تو اس کے ایک ایک لفظ میں ایسی تاثیر ہوتی ہے جو دنیا کی کوئی طاقت پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی لیے ہر داعی کو اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ کیا میں واقعی اللہ کے لیے بول رہا ہوں؟ کیا میری دعوت اُس کو راضی کرنے کے لیے ہے جس نے مجھے زبان دی؟ اگر ہاں، تو یہی وہ دعوت ہے جو رب کے ہاں مقبول ہے، اور دنیا میں مؤثر۔

علم و فہم

دعوتِ دین ایک مقدس فریضہ ہے، اور اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے داعی کے اندر جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ ہے "علم اور فہم"۔ ایسا علم جو وحی سے جڑا ہو، ایسا فہم جو دین کی روح کو سمجھے، اور ایسی بصیرت جو زمانے کے بدلتے ہوئے سوالات کو پہچان سکے۔ بغیر علم کے دعوت، نادان سوار کا وہ سفر ہے جو نہ خود منزل پر پہنچتا ہے، نہ دوسروں کو راستہ دکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا:

"قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي، أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي"

(یوسف:108)

ترجمہ: "کہہ دیجیے: یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ بھی جنہوں نے میری پیروی کی۔"

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ دعوتِ دین کا اصل راستہ "بصیرت" یعنی علم، فہم، اور گہرے ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ داعی اگر قرآن، سنت، سیرتِ نبوی، اور شریعت کی بنیادوں سے ناآشنا ہو، تو وہ دین کا پیغام صحیح طریقے سے نہ پہنچا سکے گا اور نہ خود فتنے سے محفوظ رہ سکے گا۔

علم کا مطلب صرف معلومات کا انبار نہیں، بلکہ دل کی گہرائی سے حق کو پہچاننا اور عقل کی روشنی میں اسے سمجھنا ہے۔ ایسا علم جو نافع ہو، جو عمل سے جُڑا ہو، اور جو زمانے کی زبان سمجھتا ہو۔ ایک داعی کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ جس شخص سے بات کر رہا ہے، اس کے

سوالات کیا ہیں، شبہات کس نوعیت کے ہیں، اور ذہن کی ساخت کیسی ہے۔ اس کے بغیر وہ محض اپنی بات دہرا رہا ہوگا، نہ کہ دلوں سے بات کر رہا ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين"(صحیح بخاری)

ترجمہ: "جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔"
یہ حدیث دعوت کے میدان میں علم و فہم کی برکت اور اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔

علم و فہم کی کمی بعض اوقات داعی کو شدت پسندی، جذباتیت یا غیر ضروری بحث و جدال کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے برعکس، علم سے بھرپور داعی بات بھی تول کر کرتا ہے، موضوع بھی منتخب کرتا ہے، اور انداز بھی ایسا اختیار کرتا ہے جو حکمت و بصیرت سے بھرا ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں جہاں الحاد، لبرل ازم، سائنسی سوالات، اور مذہب بیزاری جیسے فکری چیلنجز سامنے آ رہے ہیں، ان حالات میں اسے عقائد، فقہ، سیرت، اخلاقیات، مناظرہ، مکالمہ، جدید فلسفہ، فلسفۂ سائنس اور سوشل سائنسز کی بھی کچھ نہ کچھ سمجھ ہونی چاہیے تاکہ وہ دین کو ایک جامع، متوازن اور معقول انداز میں پیش کر سکے۔

علم داعی کا ہتھیار ہے، اور فہم اس کی ڈھال۔ جب یہ دونوں وصف کسی دل میں جمع ہو جائیں، تو وہ داعی صرف بولتا نہیں، دلوں میں اتر جاتا ہے، اور وہ دعوت محض تقریر نہیں رہتی، بلکہ ایک روشنی بن جاتی ہے۔

صبر و برداشت

دعوتِ دین کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں بھری راہ ہے۔ یہ وہ سفر ہے جس میں داعی کو تعریف سے زیادہ طعنوں کا سامنا ہوتا ہے، محبت سے پہلے نفرت ملتی ہے، اور راستہ آسانی سے پہلے آزمائشوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ایسے میں جو وصف ایک داعی کو استقامت، وقار، اور ہمت عطا کرتا ہے، وہ ہے "صبر و برداشت"۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر انبیائے کرام علیہم السلام کو صبر کی تلقین کی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر فرمایا:

"فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ"(الاحقاف:35)

ترجمہ: "پس آپ صبر کریں جیسے بلند حوصلہ رسولوں نے صبر کیا۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ دعوت کا کام "صبر کا کام" ہے۔ اگر داعی جلد بازی کرے، بدلہ لینے کی سوچ رکھے، یا تنقید اور مخالفت سے گھبرا جائے، تو وہ بہت جلد تھک جائے گا، دل برداشتہ ہوگا، اور میدان چھوڑ دے گا۔ صبر وہ طاقت ہے جو داعی کو حالات کی سختی، لوگوں کی سخت کلامی، اور مخالفت کے طوفان میں بھی قائم رکھتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی صبر کی ایک عظیم تفسیر ہے۔ مکہ میں طعن و تشنیع، طائف میں پتھر، احد میں زخم، منافقین کی سازشیں، اہلِ کتاب کی مکاری۔ مگر آپ کا صبر، تحمل، اور درگزر ہر مقام پر غالب رہا۔ آپ نے کبھی دعوت کے میدان سے پسپائی اختیار نہ کی، نہ دل شکستہ ہوئے، اور نہ دشمنی کا جواب دشمنی سے دیا۔ بلکہ فرمایا:

"اللہم اغفر لقومی فإنہم لا یعلمون"

"اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما، وہ نہیں جانتے۔"

یہی وہ صبر ہے جو دعوت کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ کیونکہ دل فوراً نہیں بدلتے، ذہن اچانک نہیں بدلتے، بلکہ یہ وقت، شفقت، اور مسلسل خیر خواہی کے محتاج ہوتے ہیں۔ داعی کو چاہیے کہ وہ مخاطب کے ردعمل سے مایوس نہ ہو، بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ دعوت دیتا رہے۔

صبر صرف دوسروں کی مخالفت پر ہی نہیں، اپنی نفس کی خواہشات پر بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات داعی کو برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس کی بات فوری نہ سنی جائے، اس پر طنز کیا جائے، یا وہ تنہا رہ جائے۔ مگر وہ اللہ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے ثابت قدم رہتا ہے۔

صبر و برداشت، داعی کی زبان کو نرم، دل کو وسیع، اور نگاہ کو بلند بناتے ہیں۔ یہی وہ وصف ہے جس سے دلوں پر دستک دینے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور یہی وہ وصف ہے جو داعی کو "رحمت" کا پیکر بناتا ہے، نہ کہ "غلبہ" کا نمائندہ۔

حسنِ اخلاق

دعوتِ دین کا سب سے مؤثر، دیرپا، اور جاذب وصف اگر کوئی ہے تو وہ ہے حسنِ اخلاق۔ علم دلیل دیتا ہے، زبان پیغام دیتی ہے، لیکن اخلاق دل جیتتا ہے۔ ایک داعی کے لیے حسنِ اخلاق صرف ایک فضیلت نہیں بلکہ ایک ناگزیر صفت ہے۔ وہ بغیر اخلاق کے داعی نہیں بن سکتا، کیونکہ جس نے دل کو نہیں چھوا، وہ عقل کو بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک بڑا مقصد ہی اخلاق کی تکمیل تھا۔ آپ نے فرمایا:

"إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق"

ترجمہ: "مجھے تو بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ اخلاق کے اعلیٰ معیار کو مکمل کر دوں۔"

آپ کی دعوت کا سارا سفر حسنِ اخلاق کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ مکہ کے طعنہ زن، طائف کے پتھر مارنے والے، احد کے قاتل، مدینہ کے منافق - کوئی بھی ہو، آپ کی زبان پر بددعا نہ آئی، چہرے پر غضب نہ آیا، اور دل میں نفرت نہ اتری۔ بلکہ آپ کے اخلاق نے دشمنوں کو دوست بنایا، اور اجنبیوں کو عاشق بنا دیا۔

ایک داعی اگر سخت مزاج ہو، بدزبان ہو، تحقیر آمیز لہجہ رکھتا ہو، یا مغرور ہو، تو اس کی دعوت رد ہو جاتی ہے، چاہے اس کے دلائل کتنے ہی مضبوط ہوں۔ قرآن مجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

"وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ" (آلِ عمران: 159)

ترجمہ: "اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے منتشر ہو جاتے۔"

دعوت میں حسنِ اخلاق کا مطلب صرف مسکرانا نہیں، بلکہ مخاطب کے ساتھ خیر خواہی، صبر، تحمل، درگزر، سچائی، تواضع، نرمی، اور سخاوت جیسے اوصاف کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اگر

ایک داعی سچ بولتا ہے، وعدہ نبھاتا ہے، غصے کو ضبط کرتا ہے، عاجزی اختیار کرتا ہے، اور دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھتا ہے - تو یہی اس کی سب سے مؤثر دعوت بن جاتی ہے۔

آج کے دور میں جب زبانیں زہریلی، تعلقات مفاد پر مبنی، اور اختلافات شدید ہو چکے ہیں - وہاں ایک بااخلاق داعی لوگوں کے دلوں میں امید کا چراغ جلاتا ہے۔ وہ اختلاف کے باوجود عزت دیتا ہے، سوال کرنے والے کو محبت سے سنتا ہے، اور مخالفت کرنے والے کے لیے دعا کرتا ہے۔

دعوت میں دل کو متاثر کرنا اصل کامیابی ہے، اور دل صرف اسی وقت متاثر ہوتا ہے جب وہ اخلاق کے نور سے منور ہو۔ حسنِ اخلاق وہ آئینہ ہے جس میں لوگ دین کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ آئینہ صاف ہے تو لوگ خود کو سنوار لیتے ہیں، اگر وہ دھندلا ہے تو سچائی بھی دھندلا جاتی ہے۔

تواضع وانکساری

دعوت کا کام دراصل رب کی طرف بلانے کا کام ہے - اور جو شخص رب کی طرف بلانے والا ہو، وہ خود کبھی بڑائی کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ تواضع (انکساری) وہ وصف ہے جو ایک داعی کو محبوب بناتا ہے، سننے والوں کے دل کے قریب کرتا ہے، اور اس کی دعوت میں اثر پیدا کرتا ہے۔ ایک متکبر داعی، اگرچہ کتنا ہی علم رکھتا ہو، اس کی بات دل سے ٹکرا جاتی ہے؛ جبکہ ایک منکسر المزاج داعی، چاہے الفاظ سادہ رکھے، دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔

تواضع کا مطلب خود کو چھوٹا ظاہر کرنا نہیں، بلکہ حق کے سامنے جھک جانا اور دوسروں کے لیے دل کشادہ رکھنا ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو نبیوں کا خاصہ رہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ آپ کو رب العالمین نے "رحمۃ للعالمین" بنایا، آپ کا معمول تھا کہ آپ خود مہمانوں کو دروازے تک چھوڑتے، بچوں کو سلام کرتے، غلاموں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے، اور فرشِ خاک پر بیٹھ کر دین کی بات کرتے۔

آپ نے فرمایا:

"من تواضع لله رفعه الله"(صحیح مسلم)

ترجمہ: "جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے، اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔"

ایک داعی جب تواضع کے ساتھ بات کرتا ہے، سامنے والے کو حقیر نہیں سمجھتا، اپنے علم یا مقام پر فخر نہیں کرتا، تو سامع کے دل میں اس کے لیے احترام اور رغبت پیدا ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ شخص مجھے بدلنے نہیں آیا، بلکہ میری خیر چاہنے آیا ہے؛ یہ مجھے گرانے نہیں آیا، بلکہ میرے ہاتھ کو تھامنے آیا ہے۔

دعوت کا سفر صرف زبان سے نہیں، بلکہ دل سے بھی ہوتا ہے۔ اور تواضع وہ دروازہ ہے جس سے دل تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ بعض اوقات لوگ حق بات کو صرف اس لیے رد کر دیتے ہیں کہ کہنے والے کے انداز میں رعونت ہوتی ہے، لہجے میں غرور ہوتا ہے، اور آنکھوں میں تحقیر جھلکتی ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں تواضع داعی کو بچاتا ہے، اور اس کی دعوت کو سچائی کی مہک بخشتا ہے۔

تواضع داعی کے اندر نرمی، سماعت، در گزر، اور خود احتسابی پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی بات سنتا ہے، تنقید کو قبول کرتا ہے، اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے، اور ہر وقت سیکھنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو اسے "رہنما" کے بجائے "ہم سفر" بناتا ہے - اور یہی دعوت کا اصل حسن ہے۔

پس ایک سچا داعی وہی ہے جو خود کو بڑا نہ سمجھے، بلکہ اپنے رب کی بڑائی میں فنا ہو جائے؛ جو لوگوں کو جیتنا چاہے، دبانا نہیں؛ جو اصلاح چاہے، غلبہ نہیں؛ اور جو ہدایت کی روشنی کو اپنے کردار کی جھلک بنا دے۔

دل سوزی و خیر خواہی

دعوتِ دین کا سب سے گہرا رنگ، اور سب سے روشن پہلو - دلسوزی اور خیر خواہی ہے۔ ایک داعی اگر علم رکھتا ہو، بیان کا ہنر جانتا ہو، حکمت اور فہم سے مالا مال ہو، مگر اس کے دل میں مخاطب کے لیے سچی خیر خواہی نہ ہو، درد نہ ہو، تڑپ نہ ہو - تو اس کی دعوت ایک خشک تقریر بن کر رہ جاتی ہے، جس کا اثر چند لمحوں سے آگے نہیں جاتا۔

دعوت دراصل دل سے نکلنے والی پکار ہے، جو دوسرے دل کو آواز دیتی ہے۔ اور دل صرف اس آواز پر لبیک کہتا ہے جس میں سچائی کے ساتھ ساتھ محبت، ہمدردی اور دلسوزی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی خیر خواہی کا نمونہ تھی۔ آپ نے اپنی قوم کے لیے، دشمنوں کے لیے، حتیٰ کہ آپ کو اذیت دینے والوں کے لیے بھی دعا مانگی:

"اللهم اهد قومي فإنهم لا يعلمون"

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، کیونکہ وہ نہیں جانتے۔"

یہ خیر خواہی، یہ دل کا درد۔ہی اصل دعوت ہے۔یہی وہ وصف ہے جو الفاظ میں تاثیر پیدا کرتا ہے،اور مخاطب کو اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا:

"لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ، عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ، حَرِيصٌ عَلَيْكُم، بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ"(التوبہ:128)

ترجمہ:"بیشک تمہارے پاس ایک ایسے رسول آئے ہیں جو تم میں سے ہیں، تمہاری مشقت ان پر بھاری گزرتی ہے،وہ تمہاری بھلائی کے بڑے خواہاں ہیں،اور ایمان والوں کے لیے نہایت شفقت کرنے والے،رحم کرنے والے ہیں۔"

ایک داعی بھی اسی اخلاقی میراث کا وارث ہے۔اسے مخاطب کو محض قائل نہیں کرنا بلکہ اس کی بھلائی، نجات، اور فلاح کا سچا طالب ہونا چاہیے۔اس کے دل میں وہ درد ہونا چاہیے جو ماں کو بیٹے کے لیے،اور ایک دوست کو اپنے دوست کے لیے ہوتا ہے۔

خیر خواہی کا یہ مطلب نہیں کہ صرف نرم بات کی جائے، بلکہ یہ ہے کہ ہر بات خیر کے ارادے سے ہو،نہ کہ غلبے یا فتح کے جذبے سے۔داعی کی آنکھ میں محبت ہو،دل میں درد

ہو، اور زبان میں خیر ہو۔ وہ مخاطب کو غلطی پر دیکھے تو حقارت نہیں بلکہ تڑپ محسوس کرے۔ وہ مخالفت دیکھے تو دشمنی نہیں بلکہ ہمدردی ابھرے۔

آج دنیا کو دعوت کی نہیں، دلسوز دعوت کی ضرورت ہے۔ ایسے داعیوں کی ضرورت ہے جو انسانیت سے محبت کرتے ہوں، جو سچ بولیں مگر تلخی سے نہیں، جو حق پر جمے ہوں مگر رحم سے بھرے ہوں، جو نرمی سے سمجھائیں، اور اگر سختی آئے تو اس کے پیچھے بھی ہمدردی ہو۔

اگر دعوت میں دلسوزی شامل نہ ہو، تو وہ شاید مناظرہ بن جائے، دلیل بن جائے، لیکن ہدایت نہ بن سکے۔ مگر اگر ایک معمولی بات بھی اخلاص اور خیر خواہی سے کہی جائے، تو وہ دعا بن جاتی ہے-اور کبھی کبھار وہی ایک دعا کسی کی زندگی بدل دیتی ہے۔

استقامت اور ثابت قدمی

دعوت کا راستہ کبھی سیدھا اور ہموار نہیں ہوتا۔ یہ راہ صبر آزماتی ہے، کردار کو پرکھتی ہے، اور نیت کی صداقت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس راہ میں مخالفتیں بھی آتی ہیں، مایوسیاں بھی، فتنے بھی، فریب بھی، اور تنہائیاں بھی۔ ایسے میں جو وصف داعی کو جھکنے نہیں دیتا، بکھرنے نہیں دیتا، تھکنے نہیں دیتا-وہ ہے استقامت اور ثابت قدمی۔

قرآن مجید میں بارہا اہلِ ایمان کو استقامت کی تلقین کی گئی ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمایا گیا:

"فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ" (ھود:112)

ترجمہ: "پس آپ استقامت اختیار کریں، جیسے آپ کو حکم دیا گیا۔"
استقامت کا حکم محض الفاظ نہیں، بلکہ ایک پورے طرزِ حیات کا تقاضا ہے- اپنے مقصد پر جمے رہنا، طعنوں سے نہ گھبرانا، حالات سے نہ ٹوٹنا، اور ناکامیوں سے نہ مایوس ہونا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت استقامت کی درخشاں مثال ہے۔ تیرہ سال مکہ میں بے سہارا، پتھر، گالیاں، سوشل بائیکاٹ، دشمنی کی انتہا- مگر دعوت کا مشن نہ رکا، نہ بدلا۔ طائف کے پتھر ہوں یا احد کا زخم، شعبِ ابی طالب کی فاقہ کشی ہو یا مدینہ کی سیاسی سازشیں - آپ ہر حال میں ثابت قدم رہے، کیونکہ آپ کا تعلق مقصد سے نہیں، مرسل کی رضا سے تھا۔

استقامت وہ وصف ہے جو دعوت کو وقتی تحریک کے بجائے مسلسل جدوجہد بناتا ہے۔ جو داعی مخالفت یا سستی سے پیچھے ہٹ جائے، وہ دعوت کے بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ مگر جو ہر آزمائش کو ایک سیڑھی سمجھے، ہر ناکامی کو اگلے قدم کی تیاری جانے، اور ہر تھکن کو اللہ کی طرف تقرب کا ذریعہ سمجھے - وہی داعیِ ربانی بنتا ہے۔

دعوت کا کام تھکاتا ہے، تنہا کرتا ہے، اور بسا اوقات بے نتیجہ بھی محسوس ہوتا ہے - لیکن استقامت وہ داخلی روشنی ہے جو دل کو تسلی دیتی ہے کہ رب دیکھ رہا ہے، رب سن رہا ہے، اور رب جزا دینے والا ہے۔

آج دعوت کے میدان میں سب سے زیادہ کمی اگر کسی وصف کی ہے تو وہ استقامت ہے۔ فوری نتائج، فوری شہرت، فوری اثرات - جب یہ نہ ملیں تو دل گھبرا جاتا ہے۔ مگر جو دل

اللہ کی رضا پر راضی ہو، وہ موسم نہیں دیکھتا، وہ زمین نہیں تولتا، وہ صرف بو دیتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ بارش آسمان سے آئے گی، اور فصل رب اگائے گا۔

دعا اور اللہ سے تعلق

دعوتِ دین ایک ایسا عمل ہے جو محض محنت، علم، فصاحت، یا حکمت کے بل پر کامیاب نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کی اصل طاقت اللہ سے تعلق، توکل، اور مسلسل دعا میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ داعی اگرچہ لوگوں سے بات کرتا ہے، مگر حقیقت میں وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے - اور یہ عمل اُسی وقت مؤثر بنتا ہے جب داعی کا اپنا دل اللہ سے جڑا ہو، اُس کی زبان پر صرف کلامِ حق ہو، اور اس کی راتیں سجدہ و گریہ سے لبریز ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ دعوت کے میدان میں سب سے پہلا رشتہ خالق سے قائم ہوتا ہے، پھر مخلوق سے بات کی جاتی ہے۔ آپ دن میں تبلیغ کرتے، صبر کرتے، دشمنی سہتے، اور رات کو سجدے میں گڑگڑا کر اپنے رب سے عرض کرتے:

"اللهم اهد قومي فإنهم لا يعلمون"

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، وہ نہیں جانتے۔"

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کا رنگ یہی تھا:

حضرت نوحؑ کی پکار:

"رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلاً وَنَهَارًا"(نوح:5)

ترجمہ: "اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو دن رات پکارا۔"

حضرت ابراہیمؑ کی فریاد:

"رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلاَةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي" (ابراہیم:40)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لمحہ، ہر قدم، ہر کوشش دعا سے بندھا ہوا تھا۔

دعا محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ دل کا ایک جھکاؤ ہے-ایک ایسا ربط جو داعی کو اپنی محدود طاقتوں کے ساتھ، لامحدود قدرت کے مالک سے جوڑ دیتا ہے۔ جب داعی کو یہ یقین ہوتا ہے کہ ہدایت دینا میرا کام نہیں، یہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے، تو وہ غرور سے بچتا ہے، مایوسی سے بچتا ہے، اور نتائج کی جلد بازی سے محفوظ رہتا ہے۔

دعا وہ ذریعہ ہے جو داعی کو اندر سے طاقت دیتا ہے۔ وہ تنہائیوں میں بھی پرامید رہتا ہے، وہ ناکامیوں میں بھی مطمئن ہوتا ہے، کیونکہ اس کا دل اس یقین سے لبریز ہوتا ہے کہ:

"إِنَّكَ لاَ تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ، وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ"(القصص:56)

ترجمہ: "آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔"

آج جب دعوت کو بعض اوقات صرف ایک فنی، علمی یا منصوبہ بندی کا کام سمجھا جاتا ہے، تو دل کی اس عبادت -یعنی دعا- کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ ہوتے ہیں، وسائل ہوتے ہیں، محنت بھی ہوتی ہے - مگر اثر کم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ روح جو صرف رب سے مانگ کر نکلتی ہے، وہ گم ہو چکی ہوتی ہے۔

لہٰذا، ایک داعی کا سب سے پہلا ہتھیار اس کا سجدہ ہے، اس کی سب سے بڑی پناہ اس کی دعا ہے، اور اس کا سب سے سچا تعلق وہی ہے جو رب کے ساتھ ہو۔ جب دل اللہ سے جڑا

ہوتا ہے، تو زبان سے نکلنے والا ہر لفظ بھی دعا بن جاتا ہے، اور ایسی ہی دعائیں زمین پر ہدایت کے پھول اگاتی ہیں۔

لوگوں کے ساتھ مالی معاملات کی صفائی

دعوتِ دین صرف زبان سے نہیں دی جاتی - بلکہ سب سے زیادہ طاقتور دعوت وہ ہوتی ہے جو انسان کے معاملات، لین دین، مالی شفافیت، اور وعدوں کی پابندی سے ظاہر ہوتی ہے۔ خاص طور پر مالی معاملات میں امانت، دیانت، اور انصاف ایسا وصف ہے جو انسان کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے، اور دوسروں کو اسلام کے حسن کی طرف راغب کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں مالی شفافیت کو محض اخلاقی خوبی نہیں بلکہ دینی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء"(ترمذی)

ترجمہ: "سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مالی معاملات میں صفائی، دیانت، اور وعدے کی وفا- صرف دنیاوی فائدہ نہیں دیتی، بلکہ آخرت کی بلندی کا ذریعہ بھی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مکہ کے لوگ آپ کے کلمہ گو نہ تھے، مگر سب اپنے مال، امانتیں، قرض اور خرید و فروخت کے معاملات میں آپ پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ کیوں؟ کیونکہ آپ کی مالی سچائی اور شفافیت ہر شک سے پاک تھی۔ اسی

وصف نے آپ کے دعویٰ نبوت کو سننے کے لیے بھی لوگوں کے دل کو نرم کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

دعوت کے میدان میں مالی معاملات کی صفائی کا اثر سب سے دیرپا ہوتا ہے۔ اگر ایک داعی خود لین دین میں چالاکی کرے، قرض وقت پر نہ لوٹائے، ادھار دے کر بھول جائے، مال میں کمی کرے، وعدہ خلافی کرے، یا زکوٰۃ و صدقات میں خیانت کرے۔ تو اس کی دعوت بے اثر ہو جاتی ہے، چاہے وہ کتنی فصاحت سے حق بیان کرے۔

ایک سچے داعی کو چاہیے کہ وہ:

- قرض کے وعدے وقت پر پورے کرے
- ملازمین، معاونین، اور طلبا کے حقوق کا خیال رکھے
- صدقات، چندوں، اور امانتوں میں مکمل شفافیت رکھے
- لین دین میں رسید، گواہی، اور وضاحت کو معمول بنائے
- کسی کی رقم یا مال پر ناجائز قبضہ نہ کرے، نہ دیر سے ادا کرے
- مانگنے سے پہلے خود پیش کر دینے کی خوبی اختیار کرے

ایسا داعی جب دین کی بات کرے گا تو اس کے الفاظ پر بھروسہ کیا جائے گا، کیونکہ لوگ دیکھ چکے ہوں گے کہ یہ بندہ خود حق داروں کو پورا حق دیتا ہے، تو یقیناً یہ جو کہتا ہے وہ حق ہی ہو گا۔

مالی دیانت صرف معاشی بلندی کا سبب نہیں، بلکہ دعوت کی سب سے روشن دلیل ہے۔ جو داعی مالی لحاظ سے پاکباز ہو، وہ خود دعوت کا ایک خاموش مینار بن جاتا ہے - جسے لوگ دور سے دیکھ کر روشنی تلاش کرتے ہیں۔

وہ کام جن سے داعی کو احتراز کرنا چاہیے

غیر ضروری مناظروں میں الجھنا

دعوتِ دین کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو نرم کیا جائے، ان کی عقل کو بیدار کیا جائے، اور ان کے اندر اللہ کی طرف رجوع کا داعیہ پیدا کیا جائے۔ یہ کام دلیل، رحم، حکمت اور محبت کے امتزاج سے انجام پاتا ہے۔ لیکن جب داعی غیر ضروری مناظروں میں الجھ جاتا ہے، تو دعوت کا یہ حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ مناظرہ اکثر دلوں کو جوڑنے کے بجائے توڑ دیتا ہے، اور دعوت کے روحانی اثرات کو ختم کر دیتا ہے۔ سامع بحث کے دوران اپنے دفاع میں بند ہو جاتا ہے، اور حق بات بھی اسے اپنی شکست محسوس ہونے لگتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس بات کی بہترین مثال ہے کہ آپ نے کبھی بھی دعوت کو مناظرے کا انداز نہیں دیا۔ آپ کی گفتگو میں وقار، توازن، اور دل سے نکلنے والا درد نمایاں ہوتا تھا۔ آپ نے مخاطب کے وقار کو مجروح کیے بغیر بات پہنچائی، اور حکمت سے دل کو جیتنے کا انداز اختیار فرمایا۔ قرآن بھی ہمیں یہی اسلوب سکھاتا ہے کہ دعوت کا انداز "بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" ہو - یعنی نہایت دانائی اور بہترین نصیحت کے ساتھ۔ حتیٰ کہ

اگر مجبوری میں بحث کی نوبت آ بھی جائے، تو وہ بھی "بالتی ہی احسن" ہونی چاہیے - یعنی ادب، نرمی، اور حسنِ اخلاق سے بھرپور۔

عملی زندگی میں داعی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر سوال کو بحث کا آغاز نہ سمجھے۔ بعض لوگ صرف جاننا چاہتے ہیں، بعض کے پیچھے تجسس ہوتا ہے، اور بعض اوقات تنقیدی انداز بھی صرف ظاہری ہوتا ہے - اندر سے وہ شخص سننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ داعی کو چاہیے کہ پہلے مخاطب کی نیت، ذہنیت اور حالت کو سمجھے، اور پھر اس کے مطابق گفتگو کرے۔ اگر محسوس کرے کہ مخاطب بحث پر آمادہ ہے اور فائدہ نہیں، تو بات کو مہذب انداز میں مؤخر کردے یا کسی اور وقت کے لیے رکھ چھوڑے۔

نیز سوشل میڈیا یا عوامی مجالس میں بحث کے موقع پر داعی کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان پر قابو رکھے، اور مدِمقابل کے لیے خیر خواہی کا پہلو قائم رکھے۔ طنز، تمسخر، یا علمی برتری کا اظہار دعوت کی روح کے خلاف ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہدایت دل میں اترتی ہے، اور دل کبھی بھی جبر، شرمندگی یا شکست کے احساس سے کھلتا نہیں۔

پس، داعی کو ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ بحث برائے جیت سے بچے اور دعوت برائے ہدایت کی روش اپنائے۔ ج

مخاطب کو شرمندہ یا رسوا کرنا

دعوتِ دین کا تقاضا ہے کہ انسان کو اس کی غلطی کا احساس دلایا جائے، لیکن ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے وہ اپنی عزت نفس مجروح محسوس کرے یا وہ شرمندگی کے بوجھ تلے دب جائے۔ شرمندگی، ذلت، اور طعن و تشنیع کا انداز دعوت کے حسن کو بگاڑ

دیتا ہے۔ انسان اپنی فطرت میں عزت کو پسند کرتا ہے، اور جب اسے سرِ عام رسوا کیا جائے یا اس کی کمزوری کو بے پردہ انداز میں بیان کیا جائے، تو وہ دفاعی ہو جاتا ہے، ہٹ دھرمی کا شکار ہو جاتا ہے، اور دل کی زمین سخت ہو جاتی ہے - جو پھر کسی نصیحت کو قبول کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی میں ہمیں بار بار یہ پہلو ملتا ہے کہ آپ نے کبھی کسی شخص کو اس کے نام سے پکار کر شرمندہ نہیں کیا۔ جب کوئی غلطی کرتا، تو آپ عمومی انداز میں فرماتے:

"ما بال اقوامٍ یفعلون کذا و کذا..."

(کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں؟)

یہ طریقہ مخاطب کے دل کو چھو لیتا تھا، کیونکہ بات بھی پہنچ جاتی، اور عزت بھی محفوظ رہتی۔ آپ نے کبھی کسی کی غلطی کو تذلیل یا مذاق کا نشانہ نہیں بنایا، بلکہ اس کی اصلاح کے ساتھ دل جوئی بھی کی۔

آج کا داعی اگر مخاطب کے نظریات، سوالات، یا طرزِ عمل کو تمسخر، سخت لہجے یا طعنہ زنی سے رد کرتا ہے، تو وہ دعوت کے دروازے خود بند کر دیتا ہے۔ دعوت، اصلاح کے لیے ہوتی ہے، تذلیل کے لیے نہیں۔

عملی پہلو یہ ہے کہ داعی جب کسی شخص کو دعوت دے رہا ہو - چاہے وہ قریبی ہو یا اجنبی، گناہگار ہو یا مخالف - تو اسے ہمیشہ عزت، ادب، اور نرمی کے ساتھ مخاطب کرے۔ اگر کسی کو سرِ عام نصیحت کرنا ہو، تو انداز ایسا ہو کہ سننے والا احساس کرے کہ یہ بات

"میرے لیے" ہے، مگر وہ یہ بھی محسوس کرے کہ "مجھے شرمندہ نہیں کیا جارہا، بلکہ مجھے سچائی سے جوڑا جارہا ہے"۔ اگر انفرادی نصیحت ممکن ہو تو الگ سے، محبت بھرے انداز میں، نرم لہجے کے ساتھ کی جائے۔

دعوت میں نرم گفتاری، عزتِ نفس کا لحاظ، اور خیر خواہی کے جذبے کا غلبہ، دلوں میں اثر پیدا کرتا ہے۔ ورنہ سخت جملے، شرمندگی اور ذاتی حملے انسان کو قریب لانے کے بجائے ہمیشہ کے لیے دور کر دیتے ہیں۔

دعوت کو جذباتی یا انتقامی رخ دینا

دعوت ایک پر سکون، سوچا سمجھا، اور بصیرت پر مبنی عمل ہے۔ یہ کسی وقتی جذبات کے طوفان یا ذاتی انتقام کا اظہار نہیں، بلکہ وہ کام ہے جو انبیاء علیہم السلام نے صبر و تحمل، حکمت اور ہمدردی سے سرانجام دیا۔ لیکن بعض اوقات داعی کا دل کسی مخالف کی سخت بات، مخالفت، یا تلخ ردعمل سے زخمی ہو جاتا ہے، اور وہ لاشعوری طور پر اپنی دعوت کو جذباتیت یا انتقام کا رنگ دے بیٹھتا ہے۔

یہ تبدیلی دعوت کی روح کو متاثر کر دیتی ہے۔ جب داعی کا لہجہ تلخ ہو جائے، جب الفاظ میں غصہ اور لہجے میں شدت آجائے، تو دعوت اثر نہیں کرتی بلکہ دیوار بن جاتی ہے۔ مخاطب یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ مجھے سمجھانے نہیں، مجھے نیچا دکھانے آیا ہے۔ اس احساس کے بعد وہ سننے کے لیے تیار نہیں رہتا، چاہے بات کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ترین مواقع پر بھی اپنی دعوت میں جذباتی انتقام یا تلخی کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ طائف میں پتھر کھانے کے بعد بھی، جب فرشتے نے عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو ان بستی والوں کو زمین میں دھنسا دیا جائے، تو آپ نے فرمایا:

"نہیں، مجھے امید ہے کہ ان کی اگلی نسلوں میں ایسے لوگ ہوں گے جو اللہ کو پہچانیں گے۔"

یہی ہے نبوی منہج-درد، خیر خواہی، اور بلند حوصلگی۔

عملی طور پر داعی کو چاہیے کہ وہ دعوت سے پہلے اپنے دل کو صاف کرے۔ اگر کسی کی بات سے غصہ آیا ہو تو فوراً دعوت نہ دے، بلکہ کچھ وقت، کچھ دعا، اور کچھ خود احتسابی کے بعد نرمی سے بات کرے۔ اس بات کا خیال رکھے کہ دعوت کا مخاطب اُس کا دشمن نہیں، بلکہ وہ ایک گمراہ بھائی ہے جسے روشنی کی ضرورت ہے، نہ کہ تیز روشنی کی چمک سے اندھا ہونے کی۔

دورِ حاضر میں، خاص طور پر سوشل میڈیا پر، داعی جب کسی گستاخ، ملحد یا مخالف نظریے سے دوچار ہوتا ہے، تو اکثر شدید ردعمل کا شکار ہو جاتا ہے۔ جذباتی الفاظ، تند جملے، یا طعن آمیز انداز اپنانے سے نہ صرف مخاطب بھاگتا ہے بلکہ تماشائی بھی حق سے دور ہو جاتے ہیں۔

پس، دعوت کا میدان صبر، بردباری اور تحمل کا میدان ہے۔ یہاں جذبات پر قابو رکھ کر، عقل اور خیر خواہی سے بات کرنی ہوتی ہے۔ دعوت کا ہدف مخاطب کو شکست دینا

نہیں، ہدایت دینا ہوتا ہے - اور ہدایت صرف اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی خود ہدایت، سکون اور حکمت کا پیکر ہو۔

اپنے عمل سے دعوت کو جھٹلانا

دعوت کی سب سے پر اثر شکل وہ ہوتی ہے جو زبان کے ساتھ ساتھ کردار سے بھی ادا کی جائے۔ جب داعی کا قول اور عمل ہم آہنگ ہوں، تو اس کی دعوت میں صداقت، وقار اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر داعی خود ان باتوں پر عمل نہ کرے جن کی دعوت دے رہا ہو، تو اس کی بات زبان پر رہ جاتی ہے، دل میں داخل نہیں ہوتی۔ مخاطب کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے: "یہ شخص ہمیں سچائی کی طرف بلا رہا ہے، مگر خود کس راہ پر ہے؟"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور دعوت ایک دوسرے کا آئینہ تھے۔ صحابہ کرام فرماتے تھے کہ ہم نے قرآن کو مجسم صورت میں دیکھنا ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بات دلوں پر اثر کرتی تھی، اور لوگ نہ صرف قائل بلکہ عمل کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

دعوت میں سب سے بڑی رکاوٹ تب پیدا ہوتی ہے جب داعی اپنے قول سے عمل میں تضاد پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسروں کو نماز، سچائی، امانت، دیانت، تقویٰ، عدل اور حلم کی دعوت دیتا ہے، مگر خود ان صفات سے محروم ہوتا ہے۔ اس کا لباس، اس کی مجلس، اس کا اندازِ گفتگو، یا اس کے معاملات دعوت کے خلاف گواہی دے رہے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سخت انداز میں ایسے لوگوں کو مخاطب کیا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لاَ تَفْعَلُونَ، كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لاَ تَفْعَلُونَ"(الصف:2-3)

ترجمہ: "اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ نہایت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کہو جو نہ کرو۔"

عملی زندگی میں داعی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ وہ جو بھی کہے، پہلے خود اس پر عمل کی کوشش کرے۔ خاص طور پر عوامی سطح پر، جب داعی لوگوں کے سامنے ہو، تو اس کا چال چلن، مجلس کا ادب، معاملات میں دیانت، اور عام گفتگو بھی دعوت بن جاتی ہے- یا اللہ نہ کرے، دعوت کو جھٹلا بھی سکتی ہے۔

لوگ آج صرف باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، بلکہ کردار سے قائل ہوتے ہیں۔ دعوت کا اصل وزن دعوت دینے والے کے وزن پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر داعی وزنی ہو، سچا ہو، اور خود عمل کرنے والا ہو، تو سادہ بات بھی اثر کر جاتی۔

حکمت اور تدریج کو نظر انداز کرنا

دعوتِ دین صرف سچ کہنے کا نام نہیں، بلکہ سچ کو وقت، جگہ، اور مخاطب کی حالت کے مطابق بیان کرنے کا فن ہے۔ یہی فن "حکمت" کہلاتا ہے، اور یہی نبوی دعوت کا بنیادی اصول ہے۔ اگر داعی اس حکمت اور تدریج کو نظر انداز کر دے، تو وہ چاہے کتنی ہی

اچھی بات کرے، اس کا اثر کم ہو جاتا ہے - اور بعض اوقات نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا: کوئی بالکل نابلد ہوتا ہے، کوئی شبہات میں مبتلا ہوتا ہے، کوئی جزوی طور پر جانتا ہے، تو کوئی دل سے ماننے کے قریب ہوتا ہے۔ ان سب کو ایک ہی سطح پر ایک ہی انداز میں بات کہنا نہ صرف دعوت کی تاثیر کو کم کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات ردعمل، ضد یا بدگمانی کو بھی جنم دیتا ہے۔ حکمت یہ ہے کہ داعی ہر مخاطب کی ذہنی، روحانی اور علمی سطح کو پہچانے، اور اس کے مطابق بات کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کسی کو یکدم سب کچھ نہیں سکھایا، نہ ہی کسی کو بوجھل باتوں میں الجھایا۔ مکہ کے ابتدائی دور میں آپ نے صرف توحید، آخرت، اور اخلاق پر زور دیا۔ عبادات، معاملات، اور شریعت کے دیگر احکام تدریج کے ساتھ مدینہ میں نازل ہوئے۔ یہی منہج آج بھی سب سے مؤثر ہے۔

دعوت میں تدریج کا مطلب یہ نہیں کہ حق کو چھپایا جائے، بلکہ یہ ہے کہ حق کو اُس ترتیب سے پیش کیا جائے جس سے مخاطب کے دل میں نرمی، قبولیت، اور فہم پیدا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص دین سے بالکل دور ہے، تو اسے سب سے پہلے اللہ سے تعارف، مقصدِ حیات، اور محبتِ الٰہی کی طرف لایا جائے۔ اگر اس پر فوراً تفصیلی احکام، اختلافی مسائل یا جزوی فقہی نکات ڈال دیے جائیں، تو وہ بیزار ہو سکتا ہے۔

عملی طور پر داعی کو چاہیے کہ وہ مخاطب کی حالت کا جائزہ لے کر بات کرے۔ اس کے سوالات، مزاج، ذہنی پس منظر، اور علمی استعداد کو سامنے رکھے۔ ایسے موضوعات سے

ابتدا کرے جو آسان، دلچسپ، اور ضروری ہوں۔ جب داعی کی بات سننے والا خوش دلی سے قبول کرنے لگے، تب آہستہ آہستہ تفصیل، گہرائی اور دیگر پہلوؤں کی طرف لایا جائے۔

دعوت کے لیے زبان سے زیادہ دل کی حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، اور زبان کا اثر اس وقت بڑھتا ہے جب وہ وقت اور حال کے لحاظ سے بر محل ہو۔

فرقہ واریت، سیاسی تعصب، اور غیر حکیمانہ طرزِ عمل سے دعوت کو آلودہ کرنا

دعوت کا میدان ایک مقدس اور حساس فریضہ ہے۔ اس میں خیر خواہی، حکمت، اخلاص اور انسان دوستی بنیادی اصول ہیں۔ لیکن جب دعوت کو فرقہ واریت، سیاسی مفادات، قانونی بے احتیاطی یا دنیوی لالچ کو شامل کر دیا جائے تو اس کی سچائی مجروح ہو جاتی ہے، اور وہ دلوں کو جوڑنے کے بجائے توڑنے لگتی ہے۔

کچھ داعی غیر محسوس انداز میں اپنی دعوت میں مسلکی شدت، فقہی تعصب، یا سیاسی رجحانات شامل کر دیتے ہیں۔ وہ اصل دین کی طرف بلانے کے بجائے، لوگوں کو اپنے مسلک، جماعت، یا لیڈر کے اثر میں لانا مقصد بنا لیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے اسلام کا آفاقی پیغام محدود ہو جاتا ہے اور مخاطب یہ سمجھتا ہے کہ یہ دین نہیں بلکہ ایک گروہی بلانے کا عمل ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دین سے دور ہو جاتا ہے، یا پھر کسی خاص طبقے سے نفرت پال لیتا ہے۔

اسی طرح بعض داعیانِ دین ایسی جگہوں پر کام کر رہے ہوتے ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہوتے ہیں یا قانونی و معاشرتی نزاکتیں بہت حساس ہوتی ہیں۔ اگر وہ وہاں دعوت کو قانون شکنی، جذباتی تقریروں، یااشتعال انگیز انداز میں پیش کرتے ہیں، تو نہ صرف اپنی ذات بلکہ پورے قوم کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ دعوت کا منہج وہی ہونا چاہیے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اختیار کیا: صبر، حکمت، قانون کی پاسداری، اور پرامن انداز۔

دعوت کے میدان میں کام کرتے ہوئے ممکن ہے غیر اسلامی سیاسی و مذہبی تحریک سے متاثر ہو کر جنم مال و دولت کی لالچ یا سماجی فوائد کے وعدے کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے فتنے میں مبتلا ہو جائے۔ اگرچہ کسی ضرورت مند کی مدد کرنا نیکی ہے اور دعوتی تقاضا بھی، لیکن اسلام کی دعوت کو لالچ یا مفاد پرستی سے جوڑ دینا نہایت خطرناک ہے۔ ایسا محسوس نہ کرایا جائے کہ دین ایک مادی ذریعۂ منفعت ہے، اسلام قبول کرتے ہی یہ دنیوی زندگی مادی آسائش سے بھر جائے گی جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، لوگوں کو اکثر و بیشتر اسلام قبول کرنے کے بعد تنگی و پریشانی کا سامنا کرناپڑتا ہے، رشتہ ناتہ ٹوڑ لئے جاتے ہیں، سماجی سطح پر بائیکاٹ بھی ہو سکتا ہے ا،س لئے اسلام قبول کرنے کا محرک سچائی ہونی چاہئے نہ کہ دنیاوی فائدہ ہے۔ دنیاوی منفعت پر مبنی دعوت وقتی کامیابی تولاسکتی ہے، لیکن وہ اخلاص، استقامت اور روحانی بیداری پیدا نہیں کرتی جو اصل مقصد ہے۔

عملی پہلو یہ ہے کہ داعی ہر میدان میں اپنے کردار کو صاف رکھے۔ وہ کسی خاص فرقے یا جماعت کے نمائندے کے بجائے پورے دین اسلام کا نمائندہ بنے۔ وہ اپنے مخاطب

کے دل میں دین کی محبت پیدا کرے، نہ کہ سیاسی یا ذاتی نظریات کی جھلک۔ اگر وہ کسی ملک، علاقے یا قانون کے تحت کام کر رہا ہے تو ہر ممکن کوشش کرے کہ وہاں کے قوانین، امن، تہذیب اور عوامی اقدار کا احترام کرے۔ اور دعوت کو صرف خیر خواہی، اخلاص، علم اور کردار کی بنیاد پر آگے بڑھائے، نہ کہ کسی ظاہری فائدے یا دنیوی لالچ پر۔

دعوت ایک مقدس امانت ہے۔ اس میں کسی قسم کی ذاتی رنگ آمیزی، قانونی کوتاہی یا دنیاوی مفاد کی آمیزش نہ صرف دعوت کو بدنام کرتی ہے، بلکہ دین کے وقار کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔

علم کے بغیر فتویٰ دینا یا بحث چھیڑنا

دعوت دین میں علم، بصیرت، اور فہمِ دین کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے جسم میں روح کی۔ اگر داعی خود علم کے صحیح معیار پر فائز نہ ہو، اور وہ دین کے باریک اور پیچیدہ مسائل میں بلا تحقیق بات کرے یا فتوے دینے لگے، تو یہ نہ صرف خطرناک ہے بلکہ دین کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔

آج کل بعض لوگ محض چند دینی باتیں یا اقتباسات یاد کر لینے کے بعد خود کو داعی سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں، ویڈیوز، لیکچرز اور بیانات کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں - اور آہستہ آہستہ ایسے سوالات اور موضوعات پر بھی بات کرنے لگتے ہیں جن کا تعلق فقہ، عقیدہ، یا اجتہاد سے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دین

کو سادہ نہیں بلکہ الجھا کر پیش کرتے ہیں۔ مخاطبین غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یا فرقہ وارانہ مباحث میں الجھ جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

"وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ، إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولاً"(الاسراء:36)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ہر وہ بات جس کے پیچھے علم نہ ہو، اس پر انسان سے پوچھ گچھ ہو گی۔

عملی پہلو یہ ہے کہ داعی صرف اُن امور پر بات کرے جو وہ خود مکمل علم اور فہم کے ساتھ جانتا ہے۔ اگر کوئی سوال ایسا آئے جس کا وہ اہل نہ ہو تو کھلے دل سے کہے: "یہ سوال اہل علم سے معلوم کریں، میں آپ کو ان کی طرف رہنمائی کرتا ہوں۔" یہ جملہ نہ صرف داعی کے خلوص کو ظاہر کرتا ہے بلکہ دین کے وقار کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔

اسی طرح، پیچیدہ فقہی مسائل، اجتہادی اختلافات، یا اہلِ علم کے درمیان چلنے والے فکری مکالمے کو عوامی سطح پر بحث کا موضوع نہ بنایا جائے۔ اس سے عوام الجھتے ہیں، فرقہ واریت کو تقویت ملتی ہے، اور دعوت کی روحانی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔

دعوت سادگی، وضاحت، خیر خواہی اور اخلاص کا نام ہے۔ داعی وہی کامیاب ہوتا ہے جو علم کی حد میں رہ کر، حکمت کے ساتھ، اور اعترافِ نادانی کو عیب نہیں سمجھتا

باب چہارم: جدید دنیا کے مسائل سے واقفیت



فکری واعتقادی انتشار اور الحاد کا پھیلاؤ

دنیا کے ہر دور میں انسان کی سب سے بنیادی ضرورت یہ رہی ہے کہ وہ اپنے وجود، زندگی کے مقصد، اور کائنات کی حقیقت کو سمجھے۔ یہی سوالات اس کی روح کی پیاس بن کر اسے تلاش کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسلام نے انہی سوالات کے سچے اور فطری جوابات دے کر انسان کو ہدایت کے راستے پر ڈالا۔ مگر جدید دور نے ان سوالات کو دبایا، بگاڑا، اور ان کے جوابات کو بے معنی بنا دیا۔

آج کی دنیا کا سب سے شدید فکری بحران شکوک وشبہات اور الحاد (Atheism) کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ الحاد صرف خدا کے انکار پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام روحانی، دینی اور فطری اقدار کو مذاق بنا دیتا ہے۔ "خدا نہیں ہے" کا دعویٰ اب صرف فلسفے کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ یہ نئی نسل کے ذہن، جذبات، اور تعلیم کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔

اعتقادی انتشار کی بنیادیں

جدید اعتقادی الجھن کی کئی جڑیں ہیں:

- سائنسی مادّیت: وہ نظریہ کہ صرف وہی چیز "سچ" ہے جسے سائنسی آلات سے ناپا جا سکے۔
- عقل پرستی: وہ رویہ جو وحی، غیب، اور ماوراء کو غیر عقلی قرار دیتا ہے۔

- انسان پرستی: ہر انسان کو "اپنا خدا خود" بنا دینا، یعنی کوئی مطلق ہدایت نہ ماننا۔
- مذہب بیزار تعلیم: جس میں خدا، وحی، آخرت جیسے مفاہیم کو یا تو غیر ضروری یا رجعت پسند قرار دیا جاتا ہے۔

اس سب کے نتیجے میں انسان ایک ایسا وجود بن گیا ہے جو باہر سے ترقی یافتہ، مگر اندر سے خالی، بے یقین، اور متزلزل ہے۔

داعی کے لیے چیلنج

آج کے داعی کو ایک ایسے انسان سے مخاطب ہونا ہے:

- جو مذہب کو غیر سائنسی اور پسماندہ سمجھتا ہے
- جو عقل کو وحی سے بالاتر مانتا ہے
- جو سوالات سے بھرا ہوا ہے مگر سننے کے لیے تیار نہیں
- جو خود کو "آزاد" اور "غیر متعلق" سمجھتا ہے

ایسے میں اگر دعوت صرف حکم، صرف فتوے، یا محض جذبات کے انداز میں ہو تو وہ اس فکری دیوار کو نہیں توڑ سکتی۔

دعوتی حکمت اور حکمتِ نبوت

دعوت کے اس مرحلے پر داعی کو گہری فکری تیاری، روحانی یقین، اور نرم رویے کی ضرورت ہے:

- داعی وحی کے ساتھ ساتھ عقل کی زبان بھی سمجھے۔
- وہ صرف یہ نہ کہے کہ "ایمان لاؤ" بلکہ یہ دکھائے کہ ایمان ہی انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔
- وہ دین کو ماضی کا بوجھ نہیں، بلکہ مستقبل کی روشنی کے طور پر پیش کرے۔
- وہ سائل کو بدعتی یا گمراہ کہہ کر نہیں، بلکہ محبت، دلیل، اور فطرت کو ابھارتے ہوئے دعوت دے۔

یہ کام صبر، علم، گہرائی اور للّٰہیت چاہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوجہل جیسے ضدی شخص کو بھی دعوت دی، تو کبھی بددعا سے آغاز نہ کیا- بلکہ اس کے لیے بھی دل میں خیر خواہی رکھی۔ اسی انداز کی آج ضرورت ہے۔ آج کا شکوک و شبہات صرف فلسفہ نہیں، ایک فکری فتنہ ہے؛ ایک روحانی خلا ہے؛ ایک بے سمتی کا اعلان ہے۔ اور اس کا علاج صرف کتاب و سنت سے جڑے، فہم و حکمت سے بھرے، نرم دل داعی ہی کر سکتے ہیں۔

اسلام وہ دین ہے جو انسان کو خدا سے جوڑتا ہے، اور جدید دنیا نے اُسے خود سے کاٹ دیا ہے۔ اب داعی کا کام صرف پکارنا نہیں، بلکہ جوڑنا ہے - محبت، عقل، اور مثال کے ساتھ۔

عقل کا مسخ ہو جانا

اسلام عقل کو انسان کی ایک عظیم نعمت، فہم کا ذریعہ، اور ہدایت کا دروازہ قرار دیتا ہے۔ قرآن بار بار انسان کو "تفکر"، "تدبر" اور "تعقل" کی دعوت دیتا ہے۔ مگر یہ عقل، وحی کے تابع اور فطرت کے مطابق ہو تو نور بن جاتی ہے - اور اگر نفس، خواہشات یا مغربی فکر کی غلام ہو جائے تو گمراہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

جدید دنیا میں عقل کو آزاد، خود مختار اور وحی سے بے نیاز قرار دے دیا گیا ہے۔ اب عقل کو وہ حاکم بنا دیا گیا ہے جو خدا، نبوت اور آخرت پر بھی فیصلہ صادر کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل کا مسخ ہونا شروع ہوتا ہے - یعنی اپنی اصل ذمہ داری سے ہٹ جانا، اور غیر فطری افکار کی غلام بن جانا۔

عقل کے مسخ ہونے کی نمایاں شکلیں:

- وحی کا انکار یا تحقیر:
  عقل اس بات پر بضد ہو جاتی ہے کہ صرف وہی بات قابلِ قبول ہے جو انسانی تجربے یا سائنسی پیمانوں پر پوری اُترتی ہو۔

- مادّہ پرستی:
  عقل صرف محسوس، مادّی اور تجرباتی چیزوں کو "حقیقت" مانتی ہے، غیب، روح، فرشتے، وحی اور قیامت جیسے حقائق کو غیر عقلی کہہ کر رد کر دیتی ہے۔

- نفس پرستی:
  عقل کا اصل محرک علم یا دلیل نہیں بلکہ خواہش نفس بن جاتی ہے۔ انسان جو

چاہتا ہے، اسے درست کہتا ہے؛ اور جو وحی اسے ناپسند ہو، اسے غیر عقلی کہتا ہے۔

- ہر چیز پر شک و سوال:
عقل کو ایسا معیار بنا دیا گیا ہے جو کسی چیز کو "مقدس" ماننے پر آمادہ نہیں۔ اب خدا، رسول، قرآن - سب سوال کے دائرے میں آ چکے ہیں۔

- فطرت سے بے خبری:
عقل اس درجہ مادّی اور مفاد پرست اس وجہ سے ہو گئی ہے کہ وہ انسانی فطرت کی نرم، لطیف اور روحانی آوازوں کو سننے کی صلاحیت کو دبا چکی ہے۔

یہ سب کیسے ہوا؟

یہ عقل کا بگاڑ کسی ایک فرد کا نہیں، بلکہ پوری تہذیب کا فکری انحراف ہے۔ مغربی فلسفے، مادیت پر مبنی علمی انقلاب، صنعتی نظام، اور مذہب مخالف تحریکوں نے مل کر عقل کو وحی سے کاٹ دیا ہے۔ اب عقل نہ خدا کو پہچانتی ہے، نہ اپنے آپ کو۔

تعلیمی ادارے بچوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ "سوال کرو، ہر چیز پر شک کرو، اور کوئی بھی چیز اس وقت تک نہ مانو جب تک وہ تمہاری عقل و حواس میں نہ آ جائے"۔ یہ جملہ بظاہر علم دوستی ہے، مگر دراصل یہ عقل کو فطرت، یقین اور تسلیم سے کاٹ دینے کا طریقہ ہے۔

دعوت کے میدان میں اس کا اثر

جب داعی ایسے انسان سے گفتگو کرے جو عقل کو وحی پر فوقیت دیتا ہے، تو اسے صرف مذہبی زبان کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے:

- عقل کے حدود واضح کرنے ہوتے ہیں
- وحی کو عقل کا دشمن نہیں، اس کی روشنی ثابت کرنا ہوتا ہے
- فطرت اور سچائی کی اندرونی آواز کو جگانا ہوتا ہے
- تاریخ اور سیرت سے مثالیں دینا ہوتی ہیں کہ انسانی عقل کیسے بغیر وحی کے گمراہ ہوئی
- سوالات کا سامنا حکمت سے:
  سائل کے ہر سوال کو شرارت نہ سمجھا جائے؛ بعض اوقات وہ سوال راستہ بن جاتے ہیں۔
- عقل و وحی کی ہم آہنگی کی مثالیں پیش کرنا:
  اسلامی علمی ورثہ - جیسے امام ابو حنیفہ، امام غزالی، امام رازی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ - نے وحی اور عقل کی ہم آہنگی پر بہت سے دلائل دیے ہیں۔ (ان دلائل کو جاننے کے لئے اکابرین کی کتابیں زیر مطالعہ رکھیں)

فطرت کا مسخ اور اس میں تبدیلی

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک فطری سانچے پر پیدا فرمایا، جسے قرآن "فطرت اللہ" کہتا ہے۔ یہ فطرت انسان کو خیر کی طرف مائل کرتی ہے، سچائی سے ہم آہنگ رکھتی ہے، اور

رب کی بندگی کا داعیہ اس کے اندر رکھتی ہے۔ انسان فطرت پر باقی رہے تو ایمان، شرم، حیا، سچائی، عدل اور محبت جیسے اوصاف خود بخود اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

مگر جدید دنیا نے اس فطرت کے ڈھانچے کو بدلنے کی نہ صرف کوشش کی ہے، بلکہ اسے ایک سوچا سمجھا نظریہ بنا کر پیش کیا ہے۔ مغربی افکار، میڈیا، سوشل تحریکیں اور تعلیمی نظام انسان کی فطری شناخت کو مسخ کر رہے ہیں- اور یہی وہ بڑا چیلنج ہے جس کا سامنا ایک داعی کو آج کے دور میں درپیش ہے۔

فطرت کے مسخ ہونے کی اہم علامات:

- مرد و عورت کی شناخت کا بگاڑ:
    - جنس کی تبدیلی کو حق قرار دینا
    - ہم جنس پرستی کو فطری رویہ کہنا
    - مرد و عورت کے فطری فرق کو ظلم، امتیاز یا پسماندگی قرار دینا
- شرم و حیا کا خاتمہ:
    - لباس، گفتگو اور رویّے میں حیاء کا مذاق
    - پردے کو ظلم یا جبر کا نشان بنانا
    - عریانی کو فن، آزادی اور اظہار کہنا
- خاندانی نظام کی شکست:

- نکاح کی اہمیت گھٹانا، زنا کو "رشتہ" کہنا
- والدین کی اطاعت کو غلامی، اور بچوں کی خود مختاری کو اصل آزادی سمجھنا
- ماں باپ کے کردار کو غیر متعلق قرار دینا

• جنسی بے راہ روی کا فروغ:
- نوجوانوں کو جنس پرستی کے ماحول میں جھونک دینا
- فلم، اشتہارات اور انٹرنیٹ کے ذریعے فحاشی کو عام کرنا
- سیکس ایجوکیشن کے نام پر ذہن کو فطری راستے سے ہٹانا

• انسانی جبلّتوں کو نظریاتی تبدیلی کا نشانہ بنانا:
- باپ کا تصور ختم، ماں کے بغیر بچے کی پرورش کو معمول بنانا
- اولاد کو خود مختار فرد سمجھ کر اس کی فطری تربیت کو قانون کے ذریعے روکنا

یہ سب وہ نشانیاں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اب اپنے رب کے بنائے ہوئے نظام سے بھاگ کر نفس کے خود ساختہ سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ یہی فطرت کا مسخ ہے۔ جو بد ترین گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

دعوتی زاویۂ نظر:

ایک داعی کا فرض ہے کہ وہ ان مسائل کو صرف تنقید کا نشانہ نہ بنائے، بلکہ انسانی فطرت کو جگانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ:

- انسان، خواہ کتنا ہی بگڑ چکا ہو، اس کے اندر کہیں نہ کہیں فطرت کی صدا باقی ہوتی ہے۔
- داعی کو چاہیے کہ وہ اس صدا کو پہچانے، محبت، رحم اور حکمت سے اس کو ابھارے۔
- داعی معاشرے کو صرف "حرام ہے، گناہ ہے" کے الفاظ سے نہیں، بلکہ "یہ تمہارے خلاف ہے، تمہارے وجود کی فطرت کے خلاف ہے" جیسے الفاظ سے دعوت دے۔

فطرت کا بگاڑ جدید دنیا کا سب سے بڑا بحران ہے۔ یہ صرف اخلاقی زوال نہیں بلکہ انسان کی روحانی ساخت پر حملہ ہے۔ ایک داعی کا کام صرف مخالفت نہیں، بلکہ مسخ شدہ انسان کو اس کی اصل پہچان یاد دلانا ہے - محبت سے، حکمت سے، اور فطرت کی روشنی سے۔

نفسیاتی بحران: ڈپریشن، خودکشی اور بے مقصدی کا رجحان

جدید دنیا بظاہر ترقی، سہولت، معلومات اور آزادی سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن اس تمام چمک دمک کے پیچھے انسان کی روح اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے۔ آج کا انسان تنہا ہے، الجھا ہوا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد سے ناواقف ہے۔ جب مقصد نہ ہو، راستہ دھندلا ہو، اور دل خالی ہو - تو ظاہری کامیابیاں بھی سکون نہیں دے سکتیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں دنیا بھر میں ڈپریشن، بے چینی، اضطراب، بے خوابی، نفسیاتی خوف، اور سب سے بڑھ کر خودکشی کے واقعات میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔

خاص طور پر نوجوان نسل، جو ظاہری طور پر سب کچھ رکھتی ہے- تعلیم، انٹرنیٹ، آزادی، تفریح- لیکن اس کا دل خالی، ذہن بوجھل، اور روح بے چین ہے۔

یہ مسائل صرف طبّی یا وقتی نہیں، بلکہ فکری اور روحانی خلا سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب انسان کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کیوں پیدا ہوا ہے، کہاں جا رہا ہے، اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے- تو وہ اپنے وجود سے ہی بیزار ہونے لگتا ہے۔

اسلام انسان کو مقصد دیتا ہے، تحفظ دیتا ہے، اور اس کے دکھ کو معنویت عطا کرتا ہے۔
قرآن کہتا ہے:
"أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ"
دل کا سکون صرف اللہ کے ذکر میں ہے۔

یہ آیت صرف ذکر کی فضیلت نہیں، بلکہ انسان کی روحانی ساخت کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ دل جو خدا سے جڑا ہو، وہ دنیا کی ہر آزمائش سے گزر سکتا ہے۔ لیکن جو دل کٹ جائے، وہ باہر سے جتنا بھی روشن ہو، اندر سے اندھیرے میں ڈوبا ہوتا ہے۔ زندگی کا مقصد نہ ہونا اور آخرت سے انکار ڈپریشن اور خودکشی کی اصل جڑ ہے۔

ایک داعی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف مذہبی تعلیم نہ دے، بلکہ انسان کے دکھ کو سمجھے۔ وہ صرف وعظ نہ کرے، بلکہ سوال کرے:
''تمہارے دل میں جو خلا ہے، وہ کس چیز سے بھرنا چاہتے ہو؟''
یہ سوال دعوت کی کنجی بن سکتا ہے۔

بڑھتے ہوئے جرائم اور معاشرتی زوال

جب کسی معاشرے سے روحانی مرکزیت ختم ہو جائے، اخلاقی اقدار کمزور پڑ جائیں، اور انسان صرف خواہشات کا تابع بن جائے - تو وہ معاشرہ ظاہری ترقی کے باوجود اندر سے ٹوٹنے لگتا ہے۔ جدید دنیا اسی زوال کا شکار ہے۔ مادّی آسائشوں، جدید تعلیم، قانونی نظام اور سخت سزاؤں کے باوجود جرائم کا گراف تیزی سے اوپر جا رہا ہے۔

گھریلو تشدد، بچوں کے ساتھ زیادتی، قتل، چوری، دھوکہ دہی، عصمت دری، منشیات، خود غرضی، معاشرتی بے حسی - یہ سب وہ نشانیاں ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ انسان اب نہ کسی رب کے سامنے جواب دہی کا احساس رکھتا ہے، نہ ضمیر کی آواز کو سنتا ہے، اور نہ فطری حیاء کو باقی رکھ پایا ہے۔

میڈیا، فلمیں، ڈرامے، اور ویڈیوز نے جرائم کو سنجیدہ مسئلہ بنانے کے بجائے سنسنی، تفریح اور طاقت کی علامت بنا دیا ہے۔ نوجوانوں کو یہ دکھایا جاتا ہے کہ جو قانون توڑے، وہ بہادر ہے؛ جو جھوٹ بولے، وہ چالاک ہے؛ اور جو نفس کی پیروی کرے، وہ آزاد ہے۔ یہی وہ فکری ماحول ہے جس میں معاشرہ جرم کو جرم نہیں، "انتخاب" سمجھنے لگتا ہے۔ جب خدا کا خوف ختم ہو جائے، تو قانون بھی دل کو نہیں روک سکتا۔

اسلام جرم کو صرف ایک معاشرتی خرابی نہیں، بلکہ ایک روحانی بیماری سمجھتا ہے۔ کیونکہ ہر گناہ، ہر ظلم، اور ہر زیادتی سے پہلے انسان کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ "مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا" - اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں ایمان، اگر زندہ ہو، تو انسان رک جاتا ہے۔

دعوتِ دین کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ معاشرے کو رب کی نظر کا احساس دلایا جائے۔ یہ احساس صرف عبادت نہیں پیدا کرتا، بلکہ انسان کو دوسروں کے حقوق کا محافظ بناتا ہے۔ جب داعی معاشرتی جرائم کو محض قانونی یا سماجی انداز سے نہیں بلکہ ایمانی مسئلہ بنا کر پیش کرے، تو سننے والا اس پر غور کرتا ہے۔

اسلامی دعوت معاشرے میں اصلاح صرف سزا کے ذریعے نہیں چاہتی، بلکہ دل کی تبدیلی اور ضمیر کی بیداری کے ذریعے چاہتی ہے۔ ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو صرف "گناہ سے ڈرنے" کا نہیں، بلکہ اللہ سے محبت رکھنے والے، عدل کے شیدائی، اور رحم دل انسان بننے کی طرف بلائے۔

لبرل ازم، سیکولرازم اور اسلامی دعوت

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کی پوری زندگی کو ایک مرکز سے جوڑتا ہے - اور وہ مرکز ہے اللہ کی بندگی۔ اسی بندگی میں آزادی بھی ہے، عزت بھی، ترقی بھی اور سکون بھی۔ مگر جدید دنیا نے "آزادی" اور "ترقی" کو نئی بنیادوں پر قائم کیا ہے جنہیں لبرل ازم اور سیکولرازم کہا جاتا ہے۔

لبرل ازم انسان کو مکمل آزادی کا حق دیتا ہے - وہ آزادی جو کسی وحی، مذہب یا اخلاقی ضابطے کی پابند نہیں۔ ہر انسان کو اپنی مرضی کا خدا، اپنا بنایا ہوا اخلاق، اور اپنی پسند کی زندگی جینے کا حق دیا جاتا ہے - چاہے وہ فطرت سے بغاوت ہو یا خدا سے۔

سیکولرازم مذہب کو نجی معاملہ قرار دیتا ہے۔ ریاست، تعلیم، معیشت، سیاست، اور قانون - سب سے دین کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ گویا دین صرف عبادت گاہ تک محدود ہے،

باقی زندگی وحی کی رہنمائی سے خالی ہے۔ لبرل ازم انسان کو رب سے کاٹتا ہے، اور سیکولرازم دین کو معاشرے سے نکالتا ہے۔

یہ دونوں نظریے آج ہمارے نوجوانوں، تعلیمی اداروں، میڈیا اور قانون میں سرایت کر چکے ہیں۔ نوجوان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام شاید صرف "نماز، روزہ اور داڑھی" کا نام ہے، اور جدید زندگی میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ نتیجہ یہ کہ یا تو وہ دین سے بیزار ہو جاتے ہیں، یا دین کو لبرل بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دعوت کے میدان میں یہ ایک بہت نازک چیلنج ہے۔ اگر داعی صرف ان نظریات کو گالی دے، یا ان کے ماننے والوں کو فاسق کہہ دے، تو وہ سننے کے بجائے دور ہو جاتے ہیں۔ داعی کو چاہیے کہ:

- وہ لبرل ازم اور سیکولرازم کے خطرات کو عقلی اور اخلاقی دلائل سے واضح کرے
- وہ یہ دکھائے کہ حقیقی آزادی وحی کی رہنمائی میں ہے، نہ کہ خواہش کی غلامی میں
- وہ اسلام کو ایک مکمل، منظم اور فطرت کے مطابق نظامِ زندگی کے طور پر پیش کرے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اس سماج میں وحی کا پیغام پیش کیا جو خرابیوں کی انتہا کو پہونچا تھا - مگر آپ نے طعن نہیں کیا، تربیت کی؛ زبردستی نہیں کی، بلکہ حقیقت سمجھائی۔ یہی اسلوب آج بھی دعوت کو کامیاب بنا سکتا ہے۔

میڈیا اور سوشل میڈیا کے فتنوں کا پھیلاؤ

میڈیا اور سوشل میڈیا جدید دنیا کے سب سے بااثر ذرائع بن چکے ہیں۔ یہ محض خبر رسانی یا تفریح کا ذریعہ نہیں رہے، بلکہ سوچ، عقیدے، رویے اور احساسات کی تشکیل کا بڑا ہتھیار بن چکے ہیں۔ انسان دن کا بیشتر وقت انہی اسکرینوں میں گزار رہا ہے، جہاں وہ نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ متاثر بھی ہوتا ہے- بسا اوقات بے شعوری میں۔

میڈیا پر دکھایا جانے والا مواد شعوری یا لاشعوری طور پر اسلامی اقدار، شرم و حیا، عبادت، خاندانی نظام، اور روحانیت کو فرسودہ اور دقیانوسی بنا کر پیش کرتا ہے۔ دوسری جانب عریانی، آزادی، بغاوت، نفس پرستی، اور مغربی طرزِ زندگی کو "ترقی"، "روشن خیالی" اور "خوداعتمادی" کا نام دیا جاتا ہے۔

سوشل میڈیا نے ہر فرد کو "مبلّغ" اور "مؤثر" بنا دیا ہے - مگر بغیر علم، بغیر تربیت، اور بغیر کسی اخلاقی یا شرعی ذمہ داری کے۔ لوگ جو چاہیں لکھتے ہیں، جو چاہیں شیئر کرتے ہیں، اور جو چاہیں وائرل کر دیتے ہیں- خواہ وہ جھوٹ ہو، الزام ہو، فتنہ ہو، یا دین کی تحقیر۔

میڈیا اب دل و دماغ کی تشکیل کا سب سے طاقتور ہتھیار ہے- اگر یہ دین کے خلاف ہو، تو ذہن بھی فاسد ہوں گے، دل بھی خالی۔

دعوت کے میدان میں یہ ایک بڑا چیلنج ہے، اور ساتھ ہی ایک بڑا موقع بھی۔ ایک داعی کو یہ سمجھنا ہوگا کہ:

- وہ ان ذرائع سے خوفزدہ ہو کر خاموش نہ ہو جائے
- وہ خود بھی ان ذرائع کو دعوت، اصلاح اور علم کی اشاعت کے لیے استعمال کرے
- وہ دوسروں کو صرف "سوشل میڈیا نہ دیکھو" نہ کہے، بلکہ ان کی ذہن سازی کرے کہ وہ کیا دیکھیں، کیوں دیکھیں، اور کس نیت سے دیکھیں

اسلام نے "نگاہ کی حفاظت" اور "زبان کی پاکیزگی" کو دین کا حصہ بنایا ہے۔ سوشل میڈیا پر ان دونوں کا امتحان ہوتا ہے۔ ایک داعی کو اس میدان میں نئی حکمت، نئی زبان، اور نئی پیشکش کے ساتھ اترنا ہوگا تاکہ وہ دلوں اور اسکرینوں، دونوں پر اثر ڈال سکے۔

خواتین اور فیمینزم کا چیلنج

عورت ہمیشہ سے انسانیت کا مرکز، نسلوں کی معمار، اور معاشرتی استحکام کی بنیاد رہی ہے۔ اسلام نے عورت کو عزت دی، تحفظ دیا، حق دیا، اور روحانی بلندی عطا کی۔ مگر جدید دنیا نے عورت کے مقام کو یا تو بے توقیر کیا یا اسے استعمال کیا۔ اسی پس منظر میں ایک نظریہ ابھرا جسے آج "فیمینزم" کہا جاتا ہے۔

فیمینزم بظاہر عورت کے حقوق، مساوات اور آزادی کی بات کرتا ہے، لیکن در حقیقت اس نے عورت کو مرد سے مقابلہ، فطرت سے بغاوت، اور دین سے بدظنی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آج کی عورت کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ جب تک وہ مرد کی طرح نہ ہو،

وہ آزاد نہیں۔ گھر سنبھالنا، بچوں کی پرورش، شوہر کی اطاعت - سب کو "پسماندگی" اور "غلامی" کا لیبل دیا جا رہا ہے۔ ایسے میں حقیقت یہ کہ فیمینزم عورت کو آزاد نہیں کرتا، بلکہ اسے اس کے فطری مقام سے ہٹا کر نفس پرستی کا غلام بناتا ہے۔

اسلام عورت کو ماں، بیٹی، بیوی، بہن - ہر رشتے میں عزت اور وقار دیتا ہے۔ وہ اسے شرافت کے دائرے میں پروان چڑھاتا ہے، نہ کہ "استعمال کے قابل" بنا کر پیش کرتا ہے۔ حیا، پردہ، عصمت اور عفت - یہ صرف مذہبی الفاظ نہیں، بلکہ عورت کے تحفظ کی ضمانت ہیں۔

دعوت کے میدان میں عورتوں کے درمیان خواتین کو ہی کام کرنا چاہئے اور مردوں کو عورتوں کے ساتھ اختلاط سے پرہیز کرنا چاہیے۔ خواتین سے متعلق گفتگو کو محض احکام و پابندیوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ داعی کو چاہیے کہ:

- عورت کو اس کی روحانی حیثیت کا شعور دے
- اسلام میں عورت کے فطری مقام کو محبت، مثال، اور حکمت کے ساتھ پیش کرے
- فیمینزم کے مغربی ماخذ، تضادات، اور نتائج کو اخلاقی و عملی نقصان کے پہلو سے واضح کرے
- یہ دکھائے کہ اسلام عورت کو نہ کم تر سمجھتا ہے، نہ برتر - بلکہ مکمل انسان، کامل عزت دار اور عظیم ذمہ دار سمجھتا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل (گھر والوں) کے لیے بہترین ہو"۔اور آپ نے خود عورتوں کے ساتھ رحم، انصاف، مشورہ اور محبت کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔

عورت کو آزادی کی طرف بلانا غلط نہیں۔ لیکن وہ آزادی جو عدل، عفت، اور فطرت کے دائرے میں ہو۔ اسلام یہی آزادی دیتا ہے؛ باقی ہر آزادی درحقیقت ایک نیا قید خانہ ہے۔

اسلاموفوبیا

اسلام ایک دینِ امن، علم، رحم اور عدل ہے، مگر آج دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسے دہشت، شدت، جبر اور پسماندگی کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مغربی دنیا میں اسلام سے خوف (Islamophobia) کا رجحان پچھلی دو دہائیوں میں شدت سے بڑھا ہے۔ میڈیا، سیاست، تعلیمی نظام، فلموں اور لٹریچر کے ذریعے اسلام کو مسلسل غلط انداز میں پیش کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں مغرب کے عوام کی اکثریت اسلام کو اجنبی، خطرناک اور پسماندہ مذہب سمجھتی ہے۔

یہ خوف صرف فکری نہیں، عملی بھی بن چکا ہے۔ بہت سے معاشرہ میں مسلمانوں کو اپنی شناخت چھپانی پڑتی ہے؛ حجاب، داڑھی، یا اذان جیسے شعائر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال صرف مظلومیت کا تقاضا نہیں کرتی، بلکہ دانشمندانہ دعوت کی اشد

ضرورت ہے۔ اسلاموفوبیا کا توڑ غصہ یا ردعمل نہیں، بلکہ کردار، علم اور رحم کے ساتھ دعوت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طائف میں پتھر کھائے، یا مکہ میں طعنوں اور دشمنی کا سامنا کیا- تو جواب میں بددعا نہیں دی، بلکہ فرمایا:
"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، وہ جانتے نہیں۔"

آج بھی مغرب میں اسلام کے خلاف زیادہ تر دشمنی لاعلمی، تعصب، اور میڈیا کے پروپیگنڈے پر مبنی ہے۔ اس لاعلمی کا علاج صرف علم، شفقت، اور عملی اخلاق سے ممکن ہے۔

داعی کو چاہیے کہ:

- وہ اسلام کو انسانیت کے نفع، عدل، روحانی سکون اور اخلاقی بلندی کے دین کے طور پر پیش کرے
- مغربی معاشروں کے سوالات کو سمجھے، اور ان کے فریم ورک میں موجود خالی کو اجاگر کرے۔
- صرف اپنی بات نہ کرے، بلکہ مقابل کے دل کی سُن کر بات کرے
- مسلمان اقلیتوں کو خود اعتماد، حسنِ سلوک، اور اجتماعی کردار کا نمونہ بننے کی دعوت دے

اسلاموفوبیا کو ختم کرنے کا راستہ دعوت سے ہو کر گزرتا ہے۔ جب غیر مسلم مسلمانوں کو اچھا انسان، سچا دوست، مہربان پڑوسی، اور بااخلاق فرد کے طور پر دیکھیں گے - تو ان کے دل سے وہ خوف کم ہو گا جو صرف ٹی وی اسکرینوں نے پیدا کیا ہے۔

اسلام ایک عالمی پیغام ہے، اور مغرب بھی دعوت کا ایک میدان ہے - اگر ہم وہاں صرف مظلوم بن کر رہیں گے تو شاید توجہ ملے، مگر اگر ہم دین کے نمائندے بن کر کھڑے ہوں گے تو دل بھی بدلیں گے۔

تعلیم یافتہ طبقہ اور یونیورسٹیوں کے طلبہ

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، ایک ایسا طبقہ ہے جو فکری طور پر فعال، سوالات سے بھرپور، اور معاشرے کی مستقبل کی قیادت کا دعوے دار ہوتا ہے۔ ان کے ذہن میں سوال ہوتے ہیں، سوچنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور ان پر پیش کردہ ہر بات کو دلیل اور استدلال کے ترازو میں تولنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سامنے دعوت دینا ایک نازک، مگر نہایت ضروری فریضہ ہے۔

آج کا طالبعلم صرف روایتی انداز میں بات قبول نہیں کرتا۔ وہ قرآن و حدیث کی بات بھی تب سنتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ یہ بات اس کی عقل، تجربے، اور سماجی مشاہدے کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ اگر دعوتی گفتگو صرف حکم اور جذبات پر مبنی ہو، تو وہ طبقہ جو منطق، استدلال، اور مکالمہ پسند کرتا ہے، اس سے دور ہو جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ ذہن دلیل مانگتا ہے، طعنہ نہیں؛ مکالمہ چاہتا ہے، مناظرہ نہیں۔

طلبہ کے درمیان کام کرنے والے داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ:

- علمی، فکری اور عصری زبان سے واقف ہو
- تعلیم یافتہ نوجوانوں کے شبہات کو تحقیر سے نہیں بلکہ بصیرت سے سمجھے
- دین کو صرف جذباتی رنگ میں نہیں، بلکہ فکری، معاشرتی اور انسانی ضرورت کے طور پر پیش کرے
- صرف مذہبی اصطلاحات پر زور نہ دے، بلکہ ان کے باطن میں موجود حکمت، انسان دوستی، اور عدل کو نمایاں کرے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف قبائل، سرداروں اور اہلِ علم سے الگ انداز میں گفتگو فرمائی۔ یہی حکمت آج کے داعی کے لیے ضروری ہے۔ یونیورسٹیوں میں دعوت صرف دین کے دفاع کا نام نہیں، بلکہ زندگی کے بڑے سوالات کے جوابات کو احسن انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔

جب ایک داعی سادگی، سچائی، اور حکمت کے ساتھ بات کرے، تو سننے والا ضرور سوچتا ہے-اور یہی سوچ تبدیلی کا آغاز ہے۔



پانچواں باب- عقل سائنس وجذبات



عقل سائنس و جذبات کے امتزاج کی اہمیت

دعوتِ دین کا اصل ہدف صرف معلومات دینا یا عقائد سمجھانا نہیں، بلکہ انسان کے دل، دماغ، اور روح کو یکساں طور پر بیدار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مؤثر داعی نہ صرف دلیل دیتا ہے، بلکہ دل کو چھوتا ہے؛ نہ صرف سوالات کا جواب دیتا ہے، بلکہ روح کو گرما دیتا ہے؛ اور نہ صرف نظریات کی اصلاح کرتا ہے، بلکہ انسان کے باطن کو ہدایت کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

انسان ایک ایسا مرکب ہے جس میں عقل اور جذبات دونوں موجود ہیں۔ اگر اسے صرف عقل سے مخاطب کیا جائے تو وہ فہم حاصل تو کر سکتا ہے، مگر متاثر نہیں ہوتا؛ اور اگر صرف جذبات سے اپیل کی جائے، تو وہ وقتی طور پر جوش میں آ سکتا ہے، مگر دیرپا تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے دعوت کا توازن تب ہی قائم ہوتا ہے جب عقل اور جذبہ دونوں کو ساتھ لے کر چلا جائے۔

قرآن مجید کی دعوتی زبان میں یہ امتزاج بار بار نظر آتا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ دلائل سے بات کرتا ہے:

"أفلا ينظرون إلى الإبل كيف خلقت..."

(کیا وہ اونٹ کی تخلیق پر غور نہیں کرتے؟)

اور دوسری طرف:

"قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ..."

(کہہ دیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا...)

یہ دو مختلف انداز ہیں: پہلا تفکر جگاتا ہے، دوسرا رحمت کی امید دلاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی یہی جامعیت نظر آتی ہے۔ آپ نے ایک طرف قریش کے عقل مند سرداروں کو منطقی اسلوب سے قائل کیا، اور دوسری طرف حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے سامنے سورہ مریم کی تلاوت کر کے جذبات کو جھنجھوڑا۔ یہی وہ حکمت ہے جو ہر زمانے کے داعی کو سیکھنی چاہیے۔ دعوت میں عقل کے ذریعے ذہن کو قائل کیا جاتا ہے، اور جذبے کے ذریعے دل کو نرم کیا جاتا ہے - جب یہ دونوں اکٹھے ہوں، تو ہدایت کا دروازہ کھلتا ہے۔

آج کے انسان کو صرف عقیدہ نہیں چاہیے، بلکہ تسلی، سکون، محبت، اور مقصدِ زندگی کی تلاش بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت میں منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ دردِ دل اور اخلاص کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔ ایک داعی اگر صرف زبان سے بات کرے گا، تو وہ دلیل دے گا؛ لیکن اگر وہ دل سے بات کرے گا، تو وہ اثر ڈالے گا، تو آئیں علم کی بنیاد اور اسلام کے اصولی استدلال کو مختصراً سمجھنے کے ساتھ ساتھ جذباتی پہلو کو بھی سمجھتے ہیں۔ (عقلی استدلال کے تفصیلی مطالعہ کے لئے علم کلام کی کتابوں سے استفادہ فرمائیں)

علم کی بنیاد: بدیہیات

انسان کی فطرت میں یہ بات راسخ ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی کے آغاز ہی سے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ: ''میں کون ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے؟ کیا سچ ہے؟'' ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے انسان عقل، تجربہ، مشاہدہ، اور نقل سے مدد لیتا ہے۔ مگر ان سب سے پہلے، انسان علم کے سفر کی شروعات جس بنیاد سے کرتا ہے اسے "بدیہیات" کہتے ہیں۔

بدیہیات کیا ہیں؟

بدیہیات سے مراد وہ سچائیاں ہیں جنہیں عقل خود بخود، بغیر کسی استدلال کے قبول کر لیتی ہے۔ یہ وہ قضایا(propositions) ہیں جن پر نہ بحث کی ضرورت ہوتی ہے، نہ دلیل کی۔ یہ اس قدر واضح اور عقل کے قریب ہوتے ہیں کہ انکار ممکن نہیں ہوتا، اور اگر کوئی شخص انکار کرے بھی تو اس کا اپنا قول یا عمل خود اس کے انکار کو رد کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر:

- ایک ہی چیز، ایک ہی وقت میں، یا تو موجود ہو گی یا موجود نہیں ہو گی۔
- کل، جز سے بڑا ہوتا ہے۔
- ہر حادثہ کسی علت کا محتاج ہوتا ہے۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنہیں ثابت کرنے کے لیے ہمیں تجربہ یا استدلال کی ضرورت نہیں، بلکہ عقل فطری طور پر ان پر یقین کرتی ہے۔

علم کا آغاز بدیہیات سے کیوں؟

ہر علم، خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی، فلسفیانہ ہو یا سائنسی، جب بھی کوئی دعویٰ پیش کرتا ہے، تو وہ آخر کار ایسے کسی نہ کسی اصول پر قائم ہوتا ہے جسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اتنا واضح ہوتا ہے کہ بغیر استدلال کے مانا جاتا ہے۔ان مسلملت کو بدیہیات کہا جاتا ہے۔

بدیہیات وہ بنیادیں ہیں جن پر استدلال کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اگر ان بنیادوں کو نہ مانا جائے تو نہ کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے، نہ کوئی منطق، نہ کوئی تحقیق۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو سے لے کر امام رازی، ابن سینا، اور امام غزالی تک، سب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر علمی نظام کو کسی ایسے مقدمے کی ضرورت ہوتی ہے جس پر عقل ابتدائی طور پر مطمئن ہو- اور وہ بدیہیات ہیں۔

بدیہیات اور استخراج (Deduction)

استخراجی منطق میں ہم عمومی اصول سے جزئی نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لیکن ان عمومی اصولوں کو بھی تو کہیں سے اخذ کرنا پڑتا ہے؟ استخراج کا آغاز تبھی ممکن ہے جب ہمارے پاس کچھ ایسے مقدمات ہوں جنہیں ہم مانتے ہوں - اور وہ مقدمات بدیہیات ہوتے ہیں۔

مثلاً:

- ہر حادث کا محدث ہوتا ہے (بدیہی مقدمہ)
- میں حادث ہوں (پہلے نہیں تھا پھر وجود میں آیا) (بدیہی مقدمہ)
- لہٰذا میرا ایک محدث ہے

بدیہیات اور استقراء (Induction)

استقراء میں ہم مختلف جزئی مشاہدات سے عمومی اصول اخذ کرتے ہیں، جیسا کہ سائنس میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک بدیہی یقین کارفرما ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ:

''قدرت میں نظم ہے، اور جو کل ہوا تھا وہ آج بھی ہو سکتا ہے۔''

اگر یہ یقین نہ ہو تو ہم مشاہدے کو قانون کی شکل میں قبول نہیں کر سکتے۔

لہٰذا استقراء بھی بالآخر بدیہی اعتماد سے جنم لیتا ہے۔

قرآن مجید بھی انسان کی عقل کو اسی بدیہی سچائیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے:

"أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ"(ابراہیم:10)

''کیا اللہ میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟''

یہ سوال درحقیقت ایک بدیہی سچائی کو بیدار کرتا ہے: تخلیق ہے تو خالق بھی ہوگا۔

اسی طرح توحید، نبوت، اور آخرت جیسے عقائد کو قرآن بار بار عقلِ سلیم کے بدیہی اُصولوں سے جوڑتا ہے۔

بدیہیات علم کا پہلا زینہ ہیں۔ اگر انسان انہیں نہ مانے تو نہ وہ سیکھ سکتا ہے، نہ دلیل دے سکتا ہے، نہ کسی نظام کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی لیے تمام کلامی، فقہی، عقلی اور سائنسی علوم کی ابتدا بدیہی مقدمات سے ہوتی ہے، اور انہی پر ان کی پائیداری کا انحصار ہوتا ہے۔

جو دعوت، تعلیم، یا فکری نظام بدیہیات کو تسلیم نہ کرے، وہ اپنے آپ کو رد کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان، خواہ وہ سائنس سیکھے یا دین، فلسفہ پڑھے یا فقہ، سب سے پہلے اپنی عقل کے ان بنیادی چراغوں کو پہچانے۔ جنہیں بدیہیات کہتے ہیں

عقلی علوم کے دو طریقۂ کار

عقلی علوم کا پہلا طریقہ: استقراء (Induction)

عقلی علوم کی دنیا میں دو بڑے طریقہ ہائے تحقیق پائے جاتے ہیں: استقراء (Induction) اور استخراج (Deduction)۔ ان دونوں طریقوں کا فہم نہ صرف علم و فکر میں توازن پیدا کرتا ہے، بلکہ دین و سائنس کے تعلق کو بھی درست زاویے سے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس حصے میں ہم "استقراء" کو تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کریں گے، جو کہ جدید سائنس کا بنیادی طریقہ ہے۔

استقراء کا مطلب ہے:

"جزئیات کا مشاہدہ کر کے کسی کلی یا عمومی اصول تک پہنچنا"۔

یعنی ہم مختلف انفرادی مثالوں کو دیکھ کر ایک عمومی قانون یا اصول اخذ کرتے ہیں۔

مثلاً:

اگر ہم دیکھیں کہ:

- دہلی کا پانی 100 ڈگری پر اُبلتا ہے
- کراچی، قاہرہ، نیو یارک کا پانی بھی اسی درجہ حرارت پر اُبلتا ہے

تو ہم نتیجہ نکالتے ہیں:

"پانی کا نقطۂ ابال 100 ڈگری سینٹی گریڈ ہے"

یہ استقراء ہے۔ ہم نے مختلف جگہوں کے مشاہدے (جزئیات) سے ایک عمومی حقیقت (کلیہ) اخذ کی۔

یہی طریقہ جدید سائنس کا ستون ہے۔ سائنس دان مشاہدہ کرتے ہیں، تجربے کرتے ہیں، اور بار بار ان کا جائزہ لے کر عمومی قوانین بناتے ہیں - جیسے کششِ ثقل کا قانون، روشنی کا انعکاس، یا نیوٹن کے قوانین۔

لیکن یہاں ایک اہم نکتہ ہے:

استقراء یقینی (قطعی) نہیں ہوتا، بلکہ ظنی (غالب گمان) پر مبنی ہوتا ہے۔
یعنی یہ تب تک درست سمجھا جاتا ہے جب تک کوئی استثناء یا نیا تجربہ اسے غلط ثابت نہ کر دے۔اس کی مثال سائنس کی بدلتی تھیوریز ہیں۔

استقراء کا دائرہ مشاہدے تک محدود ہوتا ہے۔وہ صرف ان چیزوں پر فیصلہ دے سکتا ہے جنہیں دیکھا، ماپا، یا ناپا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس (جو استقراء پر مبنی ہے) خدا، روح، یا آخرت جیسے غیر مادی حقائق پر کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتی۔

پس، ایک داعی کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ استقراء کی بنیاد پر جو سائنس وجود میں آئی ہے، وہ اپنے دائرے میں بہت مفید ہے، مگر کامل حق نہیں۔اسے دین کا حریف یا متبادل سمجھنا علمی و منطقی غلطی ہے۔

عقلی علوم کا دوسرا طریقہ—استخراج(Deduction)

استخراج یا Deduction ایک اہم عقلی طریقہ ہے جو مقدمات (Premises) سے نتیجہ (Conclusion) اخذ کرنے پر مبنی ہوتا ہے۔اس میں ہم کسی عمومی اصول یا سچائی سے مخصوص نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر مقدمات درست ہوں، تو نتیجہ بھی لازمی طور پر درست ہو گا۔

اس طریقے کی مثال یوں سمجھی جاسکتی ہے:

- کلیہ (General Rule): ہر انسان فانی ہے۔
- جزئی (Specific Case): زید ایک انسان ہے۔
- نتیجہ (Conclusion): پس زید بھی فانی ہے۔

یہ استخراج ہے - جہاں کلی اصول سے جزئی حکم اخذ کیا گیا۔ اس طریقہ کو منطقی استدلال بھی کہا جاتا ہے اور یہ صدیوں سے فلسفہ، فقہ، منطق، اور الٰہیاتی دلائل میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

اسلامی علمیات میں استخراج کا مقام بہت اہم ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے وجود، صفات، اور آخرت کے دلائل اسی طریقۂ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

"أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" (ابراہیم:10)

"کیا اللہ میں کوئی شک ہے؟ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟"

یہاں تخلیق کائنات سے خالق کے وجود کا استدلال کیا گیا - جو استخراجی (deductive) منطق کا طریقہ ہے۔

استخراج کا فائدہ یہ ہے کہ یہ حقائق کو قطعی (definitive) سطح پر بیان کرتا ہے، بشر طیکہ اس کی بنیاد سچی ہو۔ مثلاً اگر ہم مانتے ہیں کہ "ہر ظلم گناہ ہے" اور یہ کہ "رب کی نافرمانی ظلم ہے"، تو نتیجہ خود بخود سامنے آتا ہے کہ "رب کی نافرمانی گناہ ہے۔"

دعوت کے میدان میں یہ طریقہ بہت مؤثر ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کے ساتھ جو منطق، فلسفہ، اور اصولی استدلال سے بات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ مذہب کے عقلی دلائل (وجودِ خدا، نبوت، وحی) کا بڑا حصہ اسی استخراجی طریقے پر قائم ہوتا ہے۔

اسلامی دعوت میں ان دونوں کا استعمال لازم ہے استقراء سے کائنات کے مشاہدات کو بنیاد بنایا جائے، اور استخراج سے توحید اور نبوت کی طرف استدلال کیا جائے۔

خدا، صفات خدا اور نبوت کے عقلی دلائل

علت و معلول کی دلیل (Cosmological Argument)

انسانی عقل کا پہلا فطری سوال یہ ہوتا ہے:
"یہ سب کچھ کیسے وجود میں آیا؟"

ہم جو کچھ اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں - زمین، آسمان، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، انسان - یہ سب معلولات (effects) ہیں، یعنی کسی نہ کسی علت (cause) سے پیدا ہوئے ہیں۔
عقل اس اصول کو لازماً تسلیم کرتی ہے کہ:

"ہر حادثہ (نئی چیز) کسی علت کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔"

یہی بنیاد علت و معلول کی دلیل ہے، جس کے ذریعے عقل اس نتیجے تک پہنچتی ہے کہ کائنات کی بھی کوئی علت (سبب) ہے-اور وہ علت ایسی ہونی چاہیے:

- جو بااختیار ہو اور خود کسی علت کی محتاج نہ ہو (یعنی خود ازلی ہو)
- جو سب چیزوں کو وجود بخشے، مگر خود مخلوق نہ ہو
- جو ہر شے پر قادر ہو، اور کسی پر موقوف نہ ہو

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں ہر چیز کسی دوسری چیز سے وابستہ ہے:
درخت زمین سے، زمین سورج سے، سورج کہکشاں سے - یہ سلسلہ چلتا جاتا ہے۔ مگر عقل سوال کرتی ہے:
"کیا یہ سلسلہ ہمیشہ یوں ہی چلتا رہا؟"

اگر ہم ہر چیز کو کسی دوسری چیز کا نتیجہ مانتے چلے جائیں، تو کہیں نہ کہیں پہنچ کر یہ سلسلہ کسی ایک ابتدائی، خود موجود، غیر محتاج ہستی پر جا کر رکنا چاہیے - جسے نہ کسی نے پیدا کیا ہو، نہ جس سے پہلے کچھ ہو، بلکہ جو ہر چیز کی ابتداء ہو۔

یہی ذات اللہ ہے۔

قرآن اسی دلیل کو مختصر مگر پرزور انداز میں یوں بیان کرتا ہے:

"أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ "(الطور:35)

ترجمہ: "کیا وہ بغیر کسی (خالق) کے خود پیدا ہو گئے؟ یا وہ خود اپنے خالق ہیں؟"

یہ سوال دراصل عقل کو بیدار کرتا ہے:

اگر تم خود کو پیدا نہیں کر سکتے، اور بغیر خالق کے وجود ممکن نہیں، تو یقیناً کوئی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا- وہی تمہارا رب ہے۔

خلاصہ:

- ہر نئی چیز جو پہلے نہیں تھی پھر بعد میں وجود میں آئی اس کے لئے کوئی علت ہوتا ہے
- کائنات ایک نئی وجود (ایک حالت تھی جب کائنات نہیں تھی) ہے، لہٰذا یہ بھی کسی علت کی محتاج ہے
- یہ علت ایسا ہونا چاہیے جو بااختیار، ازلی، ابدی، غیر محتاج، اور قادرِ مطلق ہو
- عقل کہتی ہے کہ ایسا سبب صرف اللہ ہو سکتا ہے، اور کوئی نہیں

فطری دلیل (Argument from Fitrah)

انسان جب آنکھ کھولتا ہے تو وہ خود کو ایک مکمل، مربوط اور پر معنی کائنات میں پاتا ہے۔ وہ خود کو کمزور، محدود، اور سوالات سے بھرپور محسوس کرتا ہے:
میں کون ہوں؟ مجھے کس نے پیدا کیا؟ میں کہاں جا رہا ہوں؟ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

یہ سوالات محض ذہنی مشق نہیں، بلکہ انسان کی فطرت (innate nature) کا حصہ ہیں۔ قرآن اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا"(الروم:30)
ترجمہ: "یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا۔"

یہ فطرت انسان کے اندر ایک ایسی آواز ہے جو اسے بتاتی ہے:

- میں خود بخود پیدا نہیں ہوا
- میرے اوپر کوئی نگہبان، کوئی خالق، کوئی مقصد رکھنے والی ہستی ہے
- میں اکیلا، لاوارث اور بے مطلب نہیں ہوں

دنیا کے ہر دور، ہر قوم، ہر تہذیب، اور ہر فرد میں خدا کے وجود کا احساس کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے - چاہے اسے مختلف نام دیے گئے ہوں۔ حتیٰ کہ وہ انسان بھی جو "خدا کا منکر" ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کسی نہ کسی مشکل، مصیبت، یا تنہائی میں کسی ماورائی ہستی کی طرف متوجہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر خدا کا تصور سیکھا ہوا ہوتا، تو ہر انسان میں فطری طور پر موجود نہ ہوتا۔ جیسے پیاس پانی کی دلیل ہے، بھوک کھانے کی دلیل ہے -

ویسے ہی خدا کا احساس، خدا کے وجود کی سب سے پہلی دلیل ہے۔ بہت ساری تحقیق اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ملحد ماں باپ کے بچے بھی خدا کے وجود کا تصور رکھتے ہیں۔

یہ دلیل صرف عقلی نہیں، دعوتی طور پر نہایت مؤثر ہے۔ کیونکہ انسان کو اگر اس کی فطرت سے جوڑ دیا جائے، تو وہ خود اپنے اندر خدا کو محسوس کرنے لگتا ہے -اور یہی ہدایت کی شروعات ہے۔

ترتیب و نظم کی دلیل(Teleological Argument)

اگر آپ کسی کتاب کو دیکھیں جس میں ہر لفظ درست جگہ پر ہو، ابواب کی ترتیب مکمل ہو، اور مطالب گہرائی سے جُڑے ہوں - تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب خود بخود لکھی گئی؟
یقیناً نہیں! آپ فوراً کہیں گے کہ اس کے پیچھے کسی لکھنے والے، سوچنے والے، سمجھدار مصنف کا ہاتھ ہے۔

اسی طرح جب ہم پوری کائنات کو دیکھتے ہیں - زمین، سورج، چاند، ہوائیں، دریا، درخت، انسان کا جسم، جانوروں کا نظامِ زندگی، دن رات کی گردش، زندگی اور موت کا نظام - تو ایک عقل رکھنے والا انسان یہ کیسے تسلیم کرے گا کہ یہ سب کچھ بغیر کسی علم و حکمت رکھنے والے کے خود بخود ہو گیا؟

کائنات کا ہر ذرہ ہمیں چیخ چیخ کر بتا رہا ہے کہ یہ نظام اتفاق، حادثہ یا اندھی فطرت کا نتیجہ نہیں - بلکہ اس کے پیچھے ایک عالم، حکیم، اور قادر ہستی موجود ہے، جس نے ہر چیز کو ترتیب، تناسب، اور مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

قرآن اسی حقیقت کی طرف دعوت دیتا ہے:

"صُنْعَ اللهِ الَّذِی أَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ"(النمل:88)

ترجمہ: "یہ اللہ کی صناعی ہے جس نے ہر چیز کو کامل انداز سے بنایا۔"

کیا آنکھ، دل، دماغ، خون، ہوائیں، پانی، درخت، پرندے - یہ سب اپنی جگہ پر کوئی شعور، منصوبہ، اور مقصد کے بغیر قائم ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ ترتیب ہمیشہ کسی ارادے رکھنے والے فاعل کی دلیل ہوتے ہیں۔

یہ دلیل کائنات کی ظاہری خوبصورتی سے نکال کر، اس کے پیچھے چھپی عقلِ کل، ارادہ، اور حکمت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ انسان کا جسم ایک مکمل انجینئرنگ شاہکار ہے، تو وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے:
کیا یہ سب خود بخود ہو گیا؟

اسی سوچ کا اگلا قدم ہے:
"تو پھر جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، وہی میرا رب ہے۔"

اخلاقی دلیل(Moral Argument)

ہر انسان، خواہ وہ کسی بھی قوم، نسل یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو، خیر (بھلائی) اور شر (برائی) کا ایک فطری شعور رکھتا ہے۔سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ برا ہے؛انصاف اچھا ہے، ظلم برا ہے؛ معصوم کا قتل ظلم ہے، کسی کی مدد نیکی ہے - یہ باتیں انسان کو کوئی سکھاتا نہیں، بلکہ یہ اس کے اندر سے اُبھرنے والا احساس ہوتا ہے۔

یہ احساس کہاں سے آیا؟
کیا یہ صرف سوسائٹی، تعلیم یا قانون کا نتیجہ ہے؟اگر ایسا ہوتا تو تمام معاشروں میں خیر و شر کے اصول مختلف ہوتے،اور کسی برائی کو کبھی برا نہ سمجھا جاتا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کا ہر فرد، حتیٰ کہ وہ بھی جو خدا کا منکر ہے، کسی نہ کسی موقع پر "یہ غلط ہے!"اور"یہ درست ہے!" کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

یہی اخلاقی احساس، ضمیر کی گواہی،اور اندر کا فیصلہ - عقل کے لیے خدا کے وجود کی ایک زبردست دلیل بن جاتا ہے۔

جب اندر یہ آواز آتی ہے کہ "یہ صحیح ہے،اور یہ غلط"،تو عقل پوچھتی ہے: یہ معیار کہاں سے آیا؟

اگر اس کائنات کا کوئی خالق نہ ہوتا، اگر یہ سب کچھ اندھے اتفاق سے ہوا ہوتا، تو انسان کے دل میں خیر و شر کا یہ عالمگیر شعور کیسے پیدا ہو جاتا؟ کیا اندھی فطرت یا بے مقصد اتفاق ہمیں یہ سکھا سکتا ہے کہ "عدل بہتر ہے"اور"ظلم برا ہے"؟

قرآن مخاطب کرتا ہے:

"وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا"(الشمس:7–8)

ترجمہ: "اور انسان کی جان اور اُسے جس نے سنوارا، پھر اسے بدی اور پرہیز گاری کی تمیز دی۔"

یہ تمیز، یہ اندرونی گواہی، یہ ضمیر - اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو کسی نے اخلاقی رہنمائی دی ہے، اور وہ رہنمائی صرف وہی دے سکتا ہے جو خود اعلیٰ اخلاق کا سرچشمہ ہو - یعنی اللہ۔

خدا کی صفات

خالقِ کائنات کے وجود پر جب عقل مطمئن ہو جائے، تو فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

"یہ خالق کیسا ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟ کیا وہ سنتا ہے؟ کیا وہ جانتا ہے؟ کیا اس کے افعال میں حکمت ہے؟"

یہ سوال محض علمی نہیں، بلکہ عقلی و فطری بھی ہے۔ عقل خود تقاضا کرتی ہے کہ اگر کوئی ذات اتنی عظیم کائنات کی خالق ہے، تو اس کے اندر کچھ صفاتِ کمال ضرور ہوں گی۔ اور اگر وہ ذات ان صفات سے خالی ہو، تو وہ خالق نہیں ہو سکتی۔ خالقِ حقیقی کے وجود کو تسلیم کرنا، لازماً اُس کی صفاتِ کاملہ کو تسلیم کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔

اب ہم ان صفات پر الگ الگ روشنی ڈالتے ہیں:

1. حیات (زندگی)

کائنات میں حرکت، ترتیب، تبدیلی، تخلیق - یہ سب کسی زندہ ذات کا نتیجہ ہیں۔ مردہ شے نہ ارادہ کر سکتی ہے، نہ تدبیر، نہ تخلیق۔ لہٰذا خالق کا زندہ ہونا عقلی طور پر ناگزیر ہے۔

2. قدرت (اختیار اور طاقت)

کسی چیز کو وجود میں لانے، اسے سنوارنے، برقرار رکھنے، اور فنا کر دینے کے لیے کامل قدرت درکار ہوتی ہے۔ یہ کائنات، اس کی پیچیدگی اور تنوع - ایک ایسی ذات کی دلیل ہیں جس کی قدرت لامحدود ہو۔

3. علم (علم کامل)

کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے اس کا علم ضروری ہے۔ بغیر علم کے تخلیق ممکن نہیں۔ جس ذات نے انسان کے دل، دماغ، رگ و پے، حتیٰ کہ ذرے اور کہکشاں کو پیدا کیا، وہ ہر چیز کو جانتی ہے۔ یہ علم کسی خارجی سیکھنے سے حاصل نہیں، بلکہ ذاتی اور کامل ہے۔

4. ارادہ (مقصود کے ساتھ تخلیق)

اگر کائنات میں ارادہ نہ ہوتا تو اس میں مقصد، توازن اور مقصدیت نظر نہ آتی۔
جس طرح ایک عمارت انجینئر کے ارادے کے بغیر نہیں بن سکتی، ویسے ہی کائنات بغیر ارادے کے تخلیق نہیں ہو سکتی۔

5. سماعت و بصارت (سننے اور دیکھنے کی صفت)

جو خالق ہے، وہ اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ سب کچھ جانتا ہے، تو لازماً وہ سنتا اور دیکھتا بھی ہے۔ یہ صفات عقل کے نزدیک نہ صرف ممکن ہیں بلکہ ضروری ہیں۔

6. کلام (ہدایت دینے کے لیے اظہار)

انسان کے پاس شعور ہے، سوالات ہیں، ہدایت کی ضرورت ہے۔
اگر خالق انسان کو پیدا کر کے خاموش ہو جائے، تو یہ حکمت کے خلاف ہو گا۔
لہٰذا عقل تقاضا کرتی ہے کہ خالق کلام کرے-اور یہی کلام وحی کی شکل میں آیا۔

7. تکوین (پیدا کرنے اور "کن" کہنے کی قوت)

یہ کائنات صرف تخلیق نہیں، بلکہ ہر لمحہ ایک نئی تدبیر کا نتیجہ ہے۔
یہ اسی صورت ممکن ہے جب خالق کے پاس صرف اختیار نہیں، بلکہ فی الفور "ہو جانے" کی طاقت ہو۔

8. رحمت (شفقت اور عفو)

اگر کائنات صرف عدل پر ہوتی تو مجرم کبھی مہلت نہ پاتے، گناہ گاروں کو کبھی معافی نہ ملتی۔ مگر دنیا میں مہلت، توبہ، رزق، حفاظت - یہ سب ایک مہربان خالق کی نشانیاں ہیں۔

9. عدل (انصاف کی صفت)

کسی بھی خالق کے نظام میں انصاف نہ ہو، تو وہ نظام ظلم کا نمائندہ بن جاتا ہے۔
عقل کہتی ہے کہ خالق عادل ہو، تاکہ ہر ایک کو اس کا حق دے، اور ظلم سے پاک ہو۔

10. وحدانیت (یگانگت)

اگر دو خدا ہوتے تو کائنات میں نظام نہ ہوتا، بلکہ تصادم ہوتا۔ ایک خدا کسی کو زندہ کرتا، دوسرا مارتا؛ ایک چمکاتا، دوسرا بجھاتا۔ لہٰذا عقل کہتی ہے کہ خالق ایک ہی ہو سکتا ہے۔

ان تمام دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ جو ذات اس کائنات کی خالق ہے، وہ زندہ، قادر، علیم، سمیع، بصیر، متکلم، مرید، رحیم، عادل، اور احد ہے۔
یہ چند وہ صفات ہیں جن پر ایمان انسان کو عبادت، محبت، اور مکمل سپردگی کی طرف لے جاتی ہے۔

نبوت کی ضرورت پر عقلی استدلال

نبوت کی ضرورت: عقل کی روشنی میں

جب انسان عقل و شعور کے ساتھ کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ منظم، مربوط، اور حکمت بھری کائنات کسی خودکار حادثے کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک علیم و حکیم، قادر و عادل، اور سمیع و بصیر خالق کی تخلیق ہے۔ یہ خالق ہر چیز پر قادر ہے،۔ وہ اگر چاہے تو نبی بھیجے، اور اگر نہ چاہے تو نہ بھیجے -اس پر کچھ بھی واجب نہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں مکمل، بے نیاز، اور آزاد ہے۔ اس پر کوئی شریعت، قانون، یا اخلاقی فریم ورک لازم نہیں۔ وہ نبی بھیجے تو یہ اس کی رحمت و حکمت ہے، اور نہ بھیجے تو اس کا اختیار۔

انسان اگرچہ صاحبِ عقل ہے، مگر اس کی عقل محدود ہے۔ وہ تجربے، مشاہدے اور سیکھنے کے ذریعے کچھ حقائق تک پہنچ تو سکتا ہے، مگر:

- خدا کی رضا و ناراضگی کیا ہے؟
- زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟
- اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟
- کس عمل پر ثواب ہے اور کس پر عذاب؟

- مرنے کے بعد کیا ہو گا؟

ان سوالات کا جواب عقل از خود نہیں دے سکتی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں عقل رک جاتی ہے-اور وحی کا دروازہ کھلتا ہے۔

انسان جب ایک مشین بناتا ہے تو اس کے ساتھ ہدایت نامہ (Manual) بھی دیتا ہے۔

جب ہم موبائل خریدتے ہیں، گاڑی چلاتے ہیں، یا کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں- تو ہر چیز کے ساتھ طریقۂ استعمال بھی ملتا ہے۔

تو پھر کیا انسان جیسی عظیم مخلوق کو پیدا کر کے خدا نے اس کے لیے کوئی رہنمائی نہیں دی؟

خالق کا علیم و حکیم ہونا اس بات کا عقلی تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو رہنمائی (وحی) دے-اور اس وحی کو پہنچانے کے لیے نبوت کا نظام قائم کرے۔

اگر خالق انسان کو بغیر مقصد پیدا کرتا، بغیر ہدایت کے چھوڑ دیتا، اور بغیر جواب دہی کے دنیا سے گزار دیتا- تو یہ عدل اور حکمت کے خلاف ہوتا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اللہ عادل بھی ہے اور حکیم بھی۔

اسی لیے اس نے ہر قوم میں ہادی، نذیر، اور رسول بھیجے تاکہ وہ:

- انسان کو اس کے خالق سے متعارف کرائیں
- اسے بتائیں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے

- اسے سمجھائیں کہ اچھے اور برے عمل کیا ہیں
- اسے خبردار کریں کہ اس زندگی کے بعد ایک دائمی زندگی ہے

قرآن کہتا ہے:

"وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلاَّ خَلاَ فِيهَا نَذِيرٌ"(فاطر:24)

ترجمہ: "اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی نذیر (ڈر سنانے والا) نہ آیا ہو۔"

نبوت کا نظام اسی رب کی طرف سے ہے جس نے انسان کو عقل، سوال، احساس اور مقصدیت عطا کی ہے۔ نبوت وہ آسمانی جواب ہے جو انسان کے فطری سوالات کو مطمئن کرتا ہے۔

اگر نبوت نہ ہو:

- تو حق اور باطل میں فرق کیسے ہو؟
- بندگی کا صحیح طریقہ کون بتائے؟
- جزاوسزا کا اصول کیا ہو؟
- خدا کی مرضی اور پسند ناپسند کا علم کیسے ہو؟

یہ سب سوالات عقل کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نبوت کو نہ صرف مانے، بلکہ اس کی ضرورت کو دل سے تسلیم کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر عقلی دلائل:

قرآن کا اعجاز—نبوت کی سب سے بڑی عقلی دلیل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر سب سے بڑی اور زندہ دلیل قرآن مجید کا اعجاز (معجزاتی پہلو) ہے۔

قرآن کوئی عام کتاب نہیں، بلکہ ایسی فوق الفہم، فوق الفصاحت، فوق الحکمت اور فوق الزمان کتاب ہے جو چودہ صدیوں سے عقل کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔

قرآن کا معجزاتی پہلو کئی زاویوں سے ظاہر ہوتا ہے:

1. فصاحت و بلاغت کا اعجاز:

   قرآن اُس وقت نازل ہوا جب عربی زبان اپنی فصاحت کے عروج پر تھی۔
   بڑے بڑے شاعر، خطیب، اور ماہرینِ لغت قرآن سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔
   ان سے کہا گیا:

"فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" (البقرہ: 23)

کہ اگر تمہیں شک ہے، تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ۔

مگر کوئی ایک شخص، گروہ یا قبیلہ ایسا نہ تھا جو قرآن جیسی ایک مختصر سورت بھی لا سکا۔

2. غیب کی خبریں:

قرآن میں ایسی باتیں بتائی گئیں جو نہ صرف اس وقت کے انسانوں کے علم سے باہر تھیں، بلکہ بعض حقائق بعد میں ثابت ہوئے۔ مثلاً:

- روم و فارس کی جنگ کی پیش گوئی (الروم: 1-4)
- فرعون کے جسم کے محفوظ رہنے کا ذکر
- انسانی تخلیق کے مراحل

3. معنوی ہم آہنگی:

قرآن 23 سال میں مختلف حالات میں نازل ہوا، مگر اس کے مضامین، اسلوب، اور پیغام میں کہیں بھی تضاد یا انتشار نہیں۔

"لَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" (النساء:82)

4. انقلابی تاثیر:

قرآن نے ان پڑھ، جاہل، جنگجو اور وحشی قوم کو دنیا کا سب سے مہذب، بااخلاق، علم دوست، اور روحانی انسان بنا دیا- یہ تبدیلی صرف ایک ایسی کتاب سے ممکن تھی جو الہامی اور زندہ کلام ہو۔

اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ساختہ نبی ہوتے، تو وہ ایسی کتاب نہیں لا سکتے تھے جو ہر دور، ہر قوم، ہر انسان کے دل پر اترتی ہو اور دنیا کے تمام لوگ اس جیسی ایک آیت بنانے سے بھی عاجز ہوں۔

قرآن کی یہ اعجاز آفرینی خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کی تصنیف نہیں -بلکہ ایک ایسے رسول کے ذریعے نازل کی گئی جو واقعی اللہ کا نبی تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثل اخلاق—ایک عقلی دلیل

دنیا میں کسی شخص کی صداقت، دعوے کی سچائی، اور دعوت کی حقانیت کا سب سے مضبوط ثبوت اُس کا کردار ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کن، واضح، اور ناقابلِ انکار ہے، وہ آپ کا اخلاقِ عظیم ہے - جو کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔

قرآن نے خود گواہی دی:

"وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ"(القلم:4)
ترجمہ: "اور یقیناً آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی کمالات:

1. سچائی (الصدق):

نبوت سے قبل بھی آپ کو "الصادق، الامین" کہا جاتا تھا۔

کبھی جھوٹ نہ بولا، نہ قول میں، نہ عمل میں۔ حتیٰ کہ دشمنوں نے بھی آپ کو کبھی جھوٹا نہ کہا۔

2. امانت و دیانت:

سب سے زیادہ امانتیں آپ کے پاس رکھوائی جاتیں، حتیٰ کہ ہجرت کی رات بھی کفارِ مکہ کی امانتیں حضرت علیؓ کے ذریعے واپس بھجوائیں۔

3. حلم، بردباری، معافی:

طائف کے واقعے میں جب آپ پر پتھر برسائے گئے، تو بددعا کی جگہ فرمایا:
"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ جانتے نہیں۔"

4. عدل و انصاف:

قریش کی عورت ہو یا غیر قوم کی، آپ نے ہر ایک کے لیے ایک ہی قانون نافذ فرمایا۔

فرمایا:

"اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے، تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

5. تواضع و انکساری:

فتح مکہ کے دن جب تمام دشمن مغلوب ہو چکے تھے، آپ زمین پر جھکے جا رہے تھے۔ نہ کوئی غرور، نہ بدلہ۔

جس شخص کی زندگی کا ہر پہلو کمالِ صدق، دیانت، شفقت اور عدل سے بھرا ہو، وہ کسی جھوٹے مدعیِ نبوت کی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ مخالفین بھی آپ کے اخلاق کے معترف تھے۔ابو سفیان نے ہر قلِ روم کے سامنے آپ کا تعارف دیا تو کہا:

"ہم نے کبھی محمد کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔"

یہ گواہی اس وقت دی گئی جب وہ ایمان نہیں لائے تھے-اور یہ عقلی دلیل ہے کہ اتنے اعلیٰ اخلاق کا حامل انسان جھوٹا مدعیِ نبوت نہیں ہو سکتا۔

پیغام کی آفاقیت اور ہم آہنگی—نبوت کی عقلی دلیل

آج کے گلوبل دور میں معجزہ کے ساتھ نبوت کے دعوے کو جانچنے کا ایک معیار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کا پیغام انفرادی، وقتی، نسلی یا جغرافیائی حد تک محدود ہے، یا پوری انسانیت کے لیے ہمہ گیر ہو؟
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام محض عربوں یا اہلِ مکہ کے لیے نہیں، بلکہ:

"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلاَّ كَافَّةً لِلنَّاسِ" (سبأ:28)

ترجمہ: "ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے (پیغام رساں) بنا کر بھیجا۔"

آفاقیت کے نمایاں مظاہر:

1. رنگ، نسل، زبان سے بالاتر دعوت:
اسلام نے کہا: "کسی عربی کو عجمی پر، یا گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں

-صرف تقویٰ معیار ہے۔"
یہ پیغام ہر انسانی معاشرے کے لیے قابلِ قبول ہے۔

2. تمام ادوار کے لیے قابلِ عمل تعلیمات:

اسلام نے صرف اُس دور کے نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے رہنمائی فراہم کی:

- عبادات میں روحانیت
- اخلاقیات میں آفاقی اصول
- معیشت میں عدل
- سیاست میں امانت
- معاشرت میں خیر و عفت

3. انسان کی تمام جہتوں کا احاطہ:

اسلامی پیغام صرف مسجد تک محدود نہیں؛ بلکہ وہ دل، عقل، روح، جسم، فرد، خاندان، اور ریاست - ہر پہلو کو روشنی دیتا ہے۔

4. مذہب، عقل اور فطرت کی ہم آہنگی:

- اسلام نے توحید کو عقل کے مطابق پیش کیا
- اخلاق کو فطرت سے ہم آہنگ رکھا

- عبادات کو روح کی ضرورت قرار دیا
- قانون کو عدل کی بنیاد بنایا

ہم آہنگی کا عملی ثبوت:

قرآن، سنت، اور سیرتِ نبوی میں کہیں بھی تضاد، ابہام یا غیر فطری دعویٰ نہیں۔ 23 سال کے عرصے میں بتدریج جو تعلیمات آئیں، وہ نہ صرف ہم آہنگ تھیں بلکہ مکمل نظامِ زندگی کی شکل میں یکجا ہو گئیں۔ جو کسی ذاتی سوچ، محدود عقل یا وقتی بصیرت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

جو پیغام دنیا کے ہر انسان، ہر دور، ہر قوم، اور ہر حال کے لیے موزوں ہو، وہ کسی انسان کی سوچ نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے وحی ہو سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سب سے قوی عقلی پہلو یہی ہے کہ آپ کا پیغام نہ صرف اپنے دور کے مسائل کا حل تھا، بلکہ آج بھی پوری دنیا میں کروڑوں انسانوں کو زندگی کا مفہوم، مقصد اور سکون عطا کر رہا ہے۔

سائنس کیا ہے؟

سائنس ایک ایسا لفظ ہے جو بظاہر سادہ نظر آتا ہے، لیکن اس کے معنی، دائرہ کار، اور طریقۂ کار کو درست طور پر سمجھنا دعوتی حکمت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ آج کا جدید انسان "سائنس" کے لفظ سے مرعوب بھی ہے اور متاثر بھی۔ وہ اسے حق و باطل کا

معیار سمجھتا ہے، اور جو چیز سائنسی ہو وہی قابلِ قبول قرار دیتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سائنس حقیقت میں ہے کیا؟

لفظ "سائنس" کا مطلب ہے علم - یعنی وہ علم جو مشاہدہ، تجربہ، اور تجزیہ کی بنیاد پر حاصل کیا جائے۔ یہ علم کائنات، فطرت، مادّہ، توانائی، اور ان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے۔ سائنس کے دائرے میں وہ چیزیں آتی ہیں جو حواسِ خمسہ یا ان سے مربوط آلات کے ذریعے محسوس یا ماپی جا سکیں۔ اس کا میدان صرف مادی اور قابلِ تجربہ اشیاء تک محدود ہے۔

سائنس کوئی مستقل "حقیقت" (truth) نہیں، بلکہ ایک طریقۂ تحقیق (method of inquiry) ہے۔ یہ مشاہدے سے آغاز کرتی ہے، سوال اٹھاتی ہے، مفروضے قائم کرتی ہے، تجربے سے جانچتی ہے، اور نتائج اخذ کرتی ہے۔ اگر ان نتائج کو بار بار دہرا کر حاصل کیا جا سکے تو وہ ایک "سائنسی حقیقت" بن جاتے ہیں - مگر یہ حقیقت بھی عارضی ہوتی ہے، کیونکہ کوئی نیا تجربہ یا مشاہدہ پرانی تھیوری کو بدل بھی سکتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ وہ صرف اُن چیزوں پر تحقیق کر سکتی ہے جو زمان و مکان کے اندر آتی ہوں، یعنی جو مادی اور قابلِ پیمائش ہوں۔ روح، وحی، اخروی حقائق، اخلاقیات، مقصدِ حیات، اور خدا جیسے اعلیٰ اور غیر مادی تصورات اس دائرے سے باہر ہیں۔

اس لیے سائنس کا اصل تعارف یہ ہونا چاہیے کہ:

"سائنس، کائنات میں ہونے والے مادی واقعات میں خدا کی عادت و ترتیب کو سمجھنے کا ایک منظم اور مشاہداتی طریقۂ کار ہے، جو ظاہری اسباب کو جانچتا ہے مگر ماورائے اسباب حقائق کو ثابت یا رد کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔"

سائنس کے محدود دائرے

آج کے تعلیمی ماحول میں اکثر لوگ سائنس کو اس درجے پر لے آتے ہیں کہ وہ ہر سچائی کو پرکھنے، ماننے یا رد کرنے کا واحد پیمانہ بن جاتی ہے۔ سوال اُٹھایا جاتا ہے: "کیا یہ بات سائنسی ہے؟"، "کیا اس پر تجربہ کیا جا سکتا ہے؟"، یا "کیا یہ لیبارٹری میں ثابت کی جا سکتی ہے؟"- اور اگر جواب نفی میں ہو، تو اُسے فوراً غیر حقیقی، افسانوی یا غیر سائنسی کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوچ دراصل سائنس کے محدود دائرے کو نہ سمجھنے کی علامت ہے۔

سائنس صرف ان چیزوں پر بات کر سکتی ہے جو:

- مشاہدے(Observation)میں آئیں
- تجربے(Experiment)سے دہرائی جا سکیں
- ماپی جا سکیں(Measurable)
- اور مادی(Material)ہوں

اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس کا میدان مادی کائنات (Physical Universe) تک محدود ہے۔ سائنس غیر مادی، روحانی، اخلاقی، ما بعد الطبیعی

(Metaphysical)، یا اخروی حقائق کے بارے میں نہ قطعی رائے دے سکتی ہے، نہ اس کی تردید کر سکتی ہے۔

مثلاً:

- اللہ تعالیٰ کا وجود
- روح اور اس کا عالم
- وحی، نبوت، اور فرشتے
- قیامت، جنت، جہنم
- نیت، محبت، اخلاق، عدل، خوبصورتی

یہ تمام موضوعات سائنس کے دائرے سے باہر ہیں، کیونکہ نہ یہ محسوس کیے جا سکتے ہیں، نہ تجربہ کیے جا سکتے ہیں، اور نہ لیبارٹری میں دہرائے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح، سائنس قدر (value) پر بھی بات نہیں کرتی۔

مثلاً:

- کیا سچ بولنا بہتر ہے؟
- کیا ظلم برا ہے؟
- کیا خدا کی عبادت کرنا عظیم تر ہے؟

یہ سب سوالات وحی، انسانی شعور، ضمیر اور عقل کے میدان سے تعلق رکھتے ہیں -
سائنس یہاں خاموش ہے۔

دعوتی حکمت کا تقاضا ہے کہ داعی مخاطب کو یہ سمجھائے کہ :

"سائنس کی خاموشی کسی چیز کا انکار نہیں ہوتی۔"

بلکہ یہ صرف یہ بتاتی ہے کہ "یہ میرے علم کے دائرے سے باہر ہے۔"

اگر سائنس خدا پر بات نہیں کرتی، تو یہ اس کا انکار نہیں بلکہ اس کی بے بسی ہے۔

جیسے ریاضی محبت کو نہیں ناپ سکتی، مگر محبت کے وجود سے انکار نہیں کر سکتی - ایسے ہی
سائنس روحانیت، وحی یا اخلاقیات کو نہیں ماپ سکتی، مگر وہ ان کی حقیقت کو رد بھی نہیں
کر سکتی۔

سائنس اور مذہب میں تعلق کی غلط فہمیاں

جدید دور کے ذہن میں مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کے متضاد، متصادم اور
مخالف قوتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسکول، یونیورسٹی، میڈیا، اور بعض علمی حلقے
اس تصور کو اتنی شدت سے دہراتے ہیں کہ طالب علم، محقق، اور عام ذہن یہ سمجھنے لگتا
ہے کہ "یا تو سائنسی سوچ اپناؤ یا مذہبی عقائد کو مان لو" - دونوں ساتھ نہیں چل سکتے۔
یہی وہ فکری مغالطہ ہے جسے درست کرنا دعوتی ذمہ داری کا حصہ ہے۔

یہ غلط فہمی دراصل عیسائی یورپ کی تاریخ سے پیدا ہوئی، جہاں کلیسا نے سائنس کو دبانے، محققین کو سزائیں دینے، اور زمین و کائنات کے سائنسی حقائق کو "کفر" قرار دینے کا رویہ اپنایا۔ اس کے ردعمل میں مغرب نے سائنس اور مذہب کو الگ (secular) کر دیا۔ نتیجتاً وہاں "سائنس مذہب کے بغیر" اور "مذہب سائنس کے بغیر" کی بنیاد پڑی۔ لیکن اس خاص تاریخی پس منظر کو اسلامی روایت پر منطبق کرنا سراسر غلطی ہے۔

اسلام میں علم کا تصور واحد حقیقت (حق) تک پہنچنے کا ذریعہ ہے - چاہے وہ وحی کے ذریعے ہو یا عقل و مشاہدہ کے ذریعے۔ قرآن بار بار ہمیں دعوت دیتا ہے کہ کائنات کا مشاہدہ کرو، زمین و آسمان کے نظام پر غور کرو، پانی، ہوا، نباتات، انسان، رات و دن کی گردش پر تدبر کرو۔ یہ تمام آیات گویا سائنسی ذہن (سو کائنات میں خدا کی عادت اور ترتیب کو جاننے کی کوشش کرتا ہے) کو اُبھارنے والی ہیں، نہ کہ دبانے والی۔

مزید یہ کہ اسلام میں کبھی بھی سائنسدانوں، طبیبوں، فلسفیوں یا ماہرینِ فلکیات کو "دین کا دشمن" نہیں سمجھا گیا۔ امام غزالی، ابن الہیثم، البیرونی، ابن سینا، عمر خیام، ابن رشد، ابن تیمیہ اور ابن نفیس جیسے علماء نے سائنس و فلسفہ کو دین کے دائرے کے اندر رکھتے ہوئے عظیم تحقیقات کیں۔ ان کے ہاں سائنس اور دین میں تضاد نہیں بلکہ تکمیل اور ہم آہنگی تھی۔

اسلام یہ کہتا ہے کہ سائنس کائنات کے "کیسے" (how) کو سمجھاتی ہے، اور مذہب "کیوں" (why) کو بیان کرتا ہے۔ سائنس اسباب و اثرات کی دنیا میں رہتی ہے، جبکہ

وحی انسان کو اس دنیا کے مقصد، اسباب کے ماوراء خالق، اور آخرت کی تیاری کا شعور دیتی ہے۔

لہٰذا، سائنس اور مذہب میں جو تصادم آج کے ذہن میں بٹھایا جاتا ہے، وہ اسلامی فکر میں موجود نہیں۔ یہ تصادم عیسائیت کی تاریخی غلطیوں اور مغربی سیکولر فکر کا نتیجہ ہے، نہ کہ قرآن و سنت کا۔

دعوتی حکمت کا تقاضا ہے کہ داعی یہ واضح کرے کہ:

- اسلام نے سائنس کو روکا نہیں، بلکہ ترقی دی
- اسلام نے تحقیق، مشاہدے، اور تفکر کو عبادت کا درجہ دیا
- سائنس اللہ کی عادت کو سمجھنے کا ذریعہ ہے، نہ کہ انکارِ خدا کا ہتھیار
- سائنس اور وحی دونوں اپنے اپنے دائرے میں سچائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں

سائنس اور معجزات

سائنس اور معجزات کا بظاہر ایک فکری تصادم دکھایا جاتا ہے، جہاں جدید ذہن یہ سوال اٹھاتا ہے کہ "اگر سائنس قدرت کے قوانین پر مبنی ہے، تو معجزہ کیا ہے؟ اور کیا معجزہ سائنسی قوانین کی خلاف ورزی نہیں؟" اس شبہے کی جڑ اسی وقت کٹتی ہے جب ہم سائنس اور معجزہ دونوں کو ان کے اصل دائرے میں سمجھیں۔

معجزہ (مُعجِزہ) کا لغوی مطلب ہے: ایسا واقعہ جو انسانی طاقت اور قدرت سے باہر ہو اور جسے کسی نبی کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر کیا جائے، تاکہ نبوت کی سچائی پر دلیل بنے۔
یعنی معجزہ ایک الٰہی فعل ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے بنائے ہوئے قوانین کے دائرے سے باہر یا اوپر لا کر کرتا ہے، کیونکہ وہ ان قوانین کا خالق ہے، ان کا پابند نہیں۔

سائنس ان قوانینِ فطرت کو جاننے کا علم ہے، جنہیں اللہ نے کائنات کے نظم و ضبط کے لیے بنایا ہے - جیسے کششِ ثقل، حرارت، کیمیاوی تعاملات، روشنی، وقت، اور حرکت کے قوانین۔ یہ سب اللہ کے فعل کرنے کی عادت اور ترتیب ہیں۔ سائنس انہیں دریافت کرتی ہے، تخلیق نہیں۔

جب اللہ تعالیٰ چاہے، وہ فعل کے ترتیب کی عادت کو بدل بھی سکتا ہے، کائنات میں جاری اصولوں کو توڑ بھی سکتا ہے، معطل بھی کر سکتا ہے، یا وقتی طور پر تبدیل بھی کر سکتا ہے- اور یہی معجزہ ہے۔

مثلاً:

- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں نہ جلنا
- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دریا کو عصا سے چیر دینا
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا

- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چاند کا دو ٹکڑے ہونا

یہ سب واقعات اللہ کے اذن سے ظہور پذیر ہوئے، اور ان کا مقصد محض حیرت نہیں، بلکہ نبوت کی تصدیق اور ہدایت کی دلیل فراہم کرنا تھا۔

یہ سوال کہ "کیا یہ سائنس کے خلاف ہیں؟" دراصل سائنس کے دائرے کو غلط سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ سائنس صرف عادی مشاہدات پر قانون بناتی ہے، جبکہ معجزہ ایک غیر عادی اور ماورائے سائنس واقعہ ہوتا ہے۔
یعنی معجزہ نہ سائنسی قانون ہے، نہ اس کا رد۔ وہ ایک الگ دائرے سے تعلق رکھتا ہے- یعنی اللہ کے فعل کی ترتیب میں تبدیلی کا دائرہ۔

دعوتی اسلوب میں داعی کو چاہیے کہ مخاطب کو یہ فرق سمجھائے:

- سائنس خدا کے عمومی عادت پر مبنی ترتیب ہے
- معجزہ اس ترتیب سے ہٹ کر خدا کا فعل ہے
- سائنس معجزہ کو نہ رد کر سکتی ہے، نہ ثابت- کیونکہ وہ اس کے دائرہ کار سے باہر ہے

معجزہ کا انکار کرنا سائنس کا تقاضا نہیں، بلکہ ایک فلسفیانہ دعویٰ ہے- جو بعض سائنس پرست یا دہریے کرتے ہیں، مگر سائنس کی طرف سے نہیں ہوتا۔ اس لیے داعی کو معجزات کے انکار کے بجائے، معجزات کو اللہ کی قدرت اور نبوت کی صداقت کے دلائل کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔

سائنس کے متعلق صحیح رویہ

سائنس کی افادیت اور محدودیت دونوں کو سمجھنے کے بعد ضروری ہے کہ ایک مسلمان۔ بالخصوص ایک داعی۔ سائنس کے بارے میں ایک متوازن، مہذب، اور بیدار شعور پر مبنی رویہ اپنائے۔ ایسا رویہ جو نہ سائنس پرستی میں غلو کرے، نہ اسے دشمن قرار دے، بلکہ اس کو اللہ کی طرف رہنمائی کا ایک معاون ذریعہ سمجھے۔

اسلام نے ہمیشہ علم کو عزت دی ہے اور اہلِ علم کو امت کا ستون قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے جا بجا عقل، تفکر، تدبر، اور مشاہدے کی دعوت دی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے علم کو فرض قرار دیا اور طلبِ علم کو عبادت کے درجے پر رکھا۔ ایسی عظیم دینی روایت رکھنے والی امت کے لیے یہ نہایت اہم ہے کہ وہ "سائنس" جیسے جدید علم کے بارے میں اپنا رویہ درست، متوازن اور حکمت پر مبنی رکھے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کا مسلمان معاشرہ اس باب میں دو انتہاؤں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو سائنس کو محض "کفر" یا "مغرب کی سازش" سمجھ کر رد کر دیتا ہے۔ وہ ہر سائنسی تحقیق کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور علم کی جدید شکلوں کو دین سے متصادم خیال کرتا ہے۔ اس طبقے کا ردعمل دراصل ایک فکری کمزوری اور ماضی کے زوال سے پیدا شدہ احساسِ کمتری کا مظہر ہے۔ علم سے لاتعلقی، وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا، اور دنیا سے الگ تھلگ ہو کر ایک مخصوص روایتی دائرے میں محدود ہو جانا- یہ سب اس انتہا پسندی کے نتائج ہیں۔

دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو سائنس سے اس قدر مرعوب ہو چکا ہے کہ اب اسے دین اور وحی کی روشنی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ سائنس ہر مسئلے کا حل پیش کر سکتی ہے، اور جو بات سائنس سے ثابت نہ ہو، وہ حقیقت نہیں۔ یہ رویہ بھی ایک فکری گمراہی ہے، جسے "سائنس پرستی" (Scientism) کہا جاتا ہے۔ سائنس پرستی دراصل ایک خاموش الحاد ہے، جو خدا، وحی، روحانیت، اور اخلاقی قدروں کو "ناقابلِ تجربہ" کہہ کر نظرانداز کر دیتا ہے۔

اسلام ان دونوں انتہاؤں سے پاک ہے۔ اسلام کا رویہ سائنس کے بارے میں نہ انکاری ہے اور نہ اندھا عقیدتمند۔ اسلام سائنس کو اللہ کی قدرت، حکمت، اور آیاتِ تکوینیہ کو سمجھنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ زمین و آسمان کی ساخت، حیاتیات کے اسرار، پانی کی گردش، ہواؤں کی حرکت، انسان کی تخلیق، اور کائنات کے نظم و ضبط - یہ سب ایسی نشانیاں ہیں جن پر غور و فکر کرنے کو قرآن بار بار ترغیب دیتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی اسلام یہ بھی سکھاتا ہے کہ سائنس حق کا آخری معیار نہیں۔ سائنس کا دائرہ محدود ہے، اس کی بنیاد مشاہدہ، تجربہ، اور مادّی حقائق پر ہے۔ وہ نہ خدا کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے، نہ رد۔ نہ وہ روح کو سمجھ سکتی ہے، نہ آخرت کو، نہ نیت، تقویٰ، محبت، اور صدق جیسے روحانی مفاہیم کو ماپ سکتی ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ گمان کرے کہ سائنس ہی ہر سوال کا جواب ہے، وہ دراصل سائنس سے زیادہ توقع رکھ رہا ہے جتنا وہ دے سکتی ہے۔

دعوت کے میدان میں داعی کو چاہیے کہ وہ ان دونوں رویوں سے بچ کر ایک تیسری، متوازن راہ اختیار کرے۔ وہ مخاطب کو سائنسی تحقیقات کا احترام سکھائے، مگر ساتھ ہی

یہ وضاحت بھی کرے کہ وحی، نبوت، اور آخرت کے حقائق سائنس کے دائرے سے بلند تر ہیں۔ داعی مخاطب کو بتائے کہ سائنس اللہ کی قدرت کا عکس ہے، مگر وحی اُس قدرت کا پیغام ہے۔ سائنس اللہ کی کاریگری کو ظاہر کرتی ہے، اور وحی اس کاریگری کا مقصد بتاتی ہے۔

داعی خود سائنسی علوم سے واقف ہو، ان سے ڈرے نہیں، ان سے لڑے نہیں، بلکہ انہیں دعوت کا دروازہ بنالے۔ وہ سائنسی نظم، کائناتی قوانین، اور تخلیقی اسرار کو استعمال کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور توحید کی طرف اشارہ کر سکے۔ وہ مخاطب کو بتائے کہ ایک ایسا نظم، جو بغیر کسی خلل کے کائنات کو چلا رہا ہے، وہ کسی اندھی طاقت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک علیم و حکیم خالق کی منصوبہ بندی ہے۔

جب داعی سائنس کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرے گا، تو وہ جدید ذہن کو مرعوب کیے بغیر قائل کر سکے گا-اور یہی اسلام کی دعوتی حکمت ہے۔

دو انتہائیں جن سے بچنا چاہیے:

1. سائنس پرستی (Scientism):
جس میں ہر سچائی کو صرف سائنسی پیمانے سے ناپا جائے، اور وحی، دین، یا روحانیت کو غیر حقیقی یا کم تر مانا جائے۔

2. سائنس دشمنی (Anti-Science):

جس میں سائنس کو بدعت، گمراہی، یا "کافروں کا علم" سمجھا جائے، اور جدید تحقیق و فہم کو دین سے دوری کا سبب کہا جائے۔

سائنس میں مسلمانوں کی خدمات

فزکس (Physics) میں مسلمانوں کی خدمات

فزکس، یعنی طبعیات، وہ علم ہے جو مادّہ، توانائی، حرکت، وقت، اور قوت جیسے مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ سائنس کی بنیاد ہے، کیونکہ اس کے ذریعے کائنات کے بنیادی اصول سمجھے جاتے ہیں۔ اسلامی سنہری دور (8ویں سے 14ویں صدی) میں مسلمانوں نے فزکس کے میدان میں نہ صرف عظیم تحقیقات کیں بلکہ ان بنیادوں کو رکھا جن پر بعد میں یورپ کی جدید سائنس نے عمارت کھڑی کی۔

ابن الہیثم — بصریات کا بانی

فزکس میں مسلمانوں کی سب سے نمایاں خدمت ابو علی الحسن ابن الہیثم (965–1040) کی ہے۔ وہ نہ صرف مسلمان دنیا بلکہ پوری انسانیت کے لیے "Father of Optics" کہلاتے ہیں۔ ان کی کتاب "المناظر" (Kitab al-Manazir) ایک غیر معمولی سائنسی تصنیف ہے، جس میں روشنی، عکس، آنکھ کی ساخت، بینائی کے عمل، اور عدسہ سازی پر تفصیلی تحقیق کی گئی۔

ابن الہیثم نے یونانی نظریہ رد کیا کہ آنکھ روشنی خارج کرتی ہے اور کہا کہ دراصل روشنی اشیاء سے آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ اس نے کیمرہ اوبسیورا (Camera Obscura) کی ابتدائی بنیاد بھی رکھی، جو بعد میں کیمرہ سازی کا ماخذ بنی۔ یہ سب کچھ اُس زمانے میں ہوا جب یورپ میں سائنسی تحقیق معطل ہو چکی تھی۔

حرکت، قوت اور آواز

دیگر مسلم سائنسدانوں جیسے بنو موسیٰ، ثابت بن قرہ، الفارابی، ابن سینا، ابن رشد اور الجزری نے حرکت، قوت، آواز کی ترسیل، مکینیکل انجینئرنگ، اور ہائیڈرولکس جیسے موضوعات پر کام کیا۔ الجزری کی کتاب "الجامع بین العلم والعمل النافع" میں درجنوں مشینوں کی تفصیل ہے جو فزیکل قوانین پر مبنی تھیں۔ گھڑیاں، پانی اٹھانے والے آلات، خودکار نظام، اور گھومنے والے پرزے۔

تجربہ اور مشاہدے کی بنیاد

مسلمان سائنسدانوں نے یونانی فلسفے سے ہٹ کر فزکس کو تجربہ، مشاہدہ اور ریاضیاتی انداز پر استوار کیا۔ یہی وہ انداز ہے جو آج سائنس کا معیار ہے۔

ابن سینا کی "الشفاء" میں آواز کی لہر، روشنی کی رفتار، اور جسمانی حرکت پر مفصل مباحث موجود ہیں۔ اُن کے تصورات نیوٹن سے صدیوں پہلے کے ہیں، اور کئی مقامات پر جدید فزکس کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

حیاتیات (Biology) میں مسلمانوں کی خدمات

اسلامی سائنسی تاریخ میں "حیاتیات" یعنی Biology کو ایک عظیم فن کے طور پر اپنایا گیا۔ مسلمانوں نے نہ صرف جانوروں، پودوں اور انسانی جسم کا مطالعہ کیا بلکہ اس علم کو طب، زراعت، ادویہ سازی، اور ماحولیاتی شعور سے جوڑا۔ ان کا مشاہدہ باریک، ان کی تصنیفات مبسوط، اور ان کی تحقیق عملی تجربات پر مبنی تھی۔

دسویں صدی کے مشہور عالم الجاحظ (وفات: 868ء) نے حیاتیات پر سب سے پہلے قابل ذکر تصنیف پیش کی، جس کا نام تھا "کتاب الحیوان"۔ اس میں اس نے تقریباً 350 اقسام کے جانوروں کا مشاہدہ، عادات، رویے، مسکن، غذا، اور دیگر معلومات جمع کیں۔ اس کتاب میں حیوانی فطرت، بقا، اور ماحول سے تعلق پر گہری گفتگو ہے، جو بعض مغربی مفکرین کو چارلس ڈارون کی ابتدائی جھلک محسوس ہوتی ہے - اگرچہ الجاحظ کے خیالات خالص اسلامی پس منظر میں تھے۔

الرازی (865–925) نے انسانی جسم کے افعال، بیماریوں اور اعضا کی ساخت پر حیرت انگیز کام کیا۔ ابن زہر (Avenzoar) نے تشریحی عمل (Dissection) کو عملی بنیادوں پر پیش کیا اور جانوروں پر تجربے کر کے ادویہ کا اثر معلوم کیا۔

لیکن اس میدان کا سب سے روشن نام ہے: ابن النفیس (1213–1288)- جس نے خون کی گردش (Pulmonary Circulation) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے وضاحت کی کہ خون دل سے پھیپھڑوں میں جاتا ہے، وہاں آکسیجن حاصل کرتا ہے، اور پھر واپس آتا ہے - یہ دریافت ولیم ہاروے سے چار صدیاں قبل ہوئی۔

ابن بصال، ابن العوام، اور ابن بایتار جیسے سائنسدانوں نے نباتات، زراعت، اور ماحولیاتی مطالعے میں حیران کن خدمات انجام دیں۔ ابن بایتار کی کتاب "المفردات" میں پودوں اور جڑی بوٹیوں کی 1400 سے زائد اقسام کا ذکر ہے، جن میں سے اکثر کا مشاہدہ، مقام، فوائد، اور دواسازی کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

ان تمام تحقیقات کی خاص بات یہ ہے کہ وہ محض نظریاتی نہ تھیں، بلکہ معاشرے، علاج، خوراک، اور ماحول کی اصلاح کے لیے لکھی گئی تھیں۔

کیمیا(Chemistry)میں مسلمانوں کی خدمات

کیمیا، یعنی Chemistry، کو اسلامی دورِ زریں میں "علم الصنائع" اور "علم الحیل" کے ساتھ ساتھ علم الکیمیا کہا جاتا تھا۔ اس علم کا مقصد صرف مادّہ کو جاننا نہیں، بلکہ اسے بہتر، پاکیزہ، اور مفید صورت میں ڈھالنا بھی تھا۔ مسلمانوں نے اس علم کو عقلی، تجرباتی، اور عملی بنیادوں پر ترقی دی اور یورپ میں جدید کیمسٹری کی راہیں ہموار کیں۔

کیمسٹری کے میدان میں سب سے نمایاں نام ہے: ابو موسیٰ جابر بن حیان (721–815)، جنہیں مغرب میں Geber کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ "بابائے کیمیا" (Father of Chemistry) کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی سینکڑوں کتابیں کیمیا، فلکیات، فلزات، طب، اور فلسفہ پر موجود تھیں، جن میں سے کئی لاطینی میں ترجمہ ہوئیں۔

جابر بن حیان نے:

- تقطیر(Distillation)

- تبخیر(Evaporation)
- تحلیل(Filtration)
- قلمی اخراج(Crystallization)
- آتش گیر مادّوں کا مطالعہ
- تیزابوں کی تیاری(خصوصاًHCl، HNO3، Aqua Regia)

جیسے جدید کیمیکل اصولوں پر تحقیق بنیاد رکھی۔

اس نے مادّہ کی ترکیب، تبدیلی، اور خواص پر جو نظریات دیے، وہ آج بھی سائنسی اصولوں کے قریب تر ہیں۔ جابر نے سائنسی آلات بھی ایجاد کیے جن کی مدد سے کیمیکل تجربات زیادہ محفوظ اور مؤثر ہوئے۔

الرازی(865–925)، جنہیں مغرب میں Rhazes کہا جاتا ہے، نہ صرف طب کے ماہر تھے بلکہ کیمیا کے میدان میں بھی استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف دھاتوں، تیزابوں، صابن سازی، شیشے، اور دواؤں کی تیاری میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کی کتب میں تجربات کی مکمل تفصیل، آلات کی بناوٹ، اور مادّہ کی صفائی کے طریقے شامل ہیں۔

مسلمانوں کی کیمیائی تحقیق محض نظری نہیں تھی۔ ان کا ہدف:

- دوائیں بنانا

- پانی کو پاک کرنا
- کپڑے رنگنا
- دھاتیں صاف کرنا
- معدنیات سے فائدہ اٹھانا
- روزمرہ زندگی کے لیے مفید اشیاء تیار کرنا

تھا۔یہی وہ عملی رجحان تھا جس نے سائنس کو فلسفہ سے نکال کر تجربہ کی راہ دکھائی۔

ایک داعی اگراس پہلو کو اُجاگر کرے کہ مسلمان سائنسدان علم کو ایک عبادت سمجھ کر سیکھتے اور سکھاتے تھے، تو وہ اسلام کو جدید انسان کے سامنے ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کر سکتا ہے-ایسا ضابطہ جو روحانیت اور مادّہ، عقل اور عمل، تحقیق اور تزکیہ - سب کو جمع کرتا ہے۔

ریاضی اور فلکیات (Astronomy & Mathematics) میں مسلمانوں کی خدمات

ریاضی اور فلکیات، وہ دو سائنسی علوم ہیں جن پر اسلامی تہذیب نے نہ صرف گہرا اثر ڈالا بلکہ انہیں ایک روحانی اور تہذیبی مقصد کے ساتھ ترقی دی۔ یہ وہ علوم ہیں جنہوں نے نہ صرف دین (نماز، روزہ، زکات، قبلہ، تقویم) کی خدمت کی، بلکہ انسانی عقل کو ترتیب، نظم،اور تجریدی سوچ کے نئے آفاق سے روشناس کرایا۔

ریاضی کی دنیا کا سب سے روشن نام محمد بن موسیٰ الخوارزمی (780–850) ہے، جنہیں Father of Algebra کہا جاتا ہے۔ ان کی کتاب "الکتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ" نے "الجبر" کی بنیاد رکھی - جو آج بھی Algebra کے نام سے معروف ہے۔

"الگورزم" (Algorithm) کا لفظ بھی الخوارزمی کے نام سے ماخوذ ہے، جو جدید کمپیوٹر سائنس کا ستون ہے۔

الخوارزمی نے ہندسوں کی ہندسی بنیاد پر کام کیا، اعشاری نظام کو باقاعدہ استعمال کیا، اور ریاضی کو عملی زندگی سے جوڑا۔ ان کے کام کا اثر یورپ پر اتنا گہرا تھا کہ لاطینی زبان میں ان کی کتابوں کا صدیوں تک مطالعہ کیا جاتا رہا۔

عمر خیام نے الجبرا کو مزید ترقی دی اور الجبری مساوات کو درجہ بندی دی۔ ثابت بن قرہ نے اقلیدسی جیومیٹری پر تبصرے لکھے، جبکہ الکندی نے منطق، تناسب، اور ریاضیاتی فلسفہ کو فروغ دیا۔ یہ سب علماء ریاضی کو محض عددی حساب نہیں، بلکہ کائناتی نظم و ترتیب کی زبان سمجھتے تھے۔

مسلمانوں کے لیے فلکیات ایک ضرورت تھی، کیونکہ:

- نماز کے اوقات سورج سے وابستہ تھے
- قبلہ کی سمت کا تعین ستاروں سے کیا جاتا
- رمضان، عید اور حج کے لیے قمری کیلنڈر کی ضرورت تھی

اسی لیے البیرونی، ، ابن شاطر، اور طوسی جیسے ماہرین فلکیات نے عظیم خدمات انجام دیں۔

البیرونی(973–1050)نے زمین کی پیمائش، محوری گردش،اور عرض البلد و طول البلد جیسے موضوعات پر کام کیا۔ابن شاطر نے سورج کی گردش کے بارے میں ایساماڈل پیش کیاجو کاپرنیکس کے ماڈل سے مشابہ تھا- مگر وہ صدیوں پہلے کا تھا۔

مسلمانوں نے ہزاروں ستاروں کے نقشے بنائے، آبزرویٹریاں قائم کیں، اور ایسے آلہ جات ایجاد کیے جن سے اجرامِ فلکی کا مشاہدہ ممکن ہوا- جیسے اصطرلاب، ذوالجیب، اور رُبع۔

ریاضی اور فلکیات میں مسلمانوں کی خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام علم کو عبادت سے جدا نہیں کرتا۔ یہ علوم بظاہر مادی نظر آتے ہیں، مگر مسلمان سائنسدانوں نے انہیں اللہ کی قدرت اور نظامِ کائنات کی گواہی کے طور پر اپنایا۔
جب ایک مسلمان آسمان کی گردش، چاند کی منازل، ستاروں کی راہیں، اور اعداد کی ترتیب کو دیکھتا ہے، تو اس کا دل "ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً" کی صدا بلند کرتا ہے۔

دعوتِ دین میں سائنس کو براہِ راست قرآن سے ثابت کرنے کی بجائے، مسلمانوں کی سائنسی خدمات کو بنیاد بنانا کیوں ضروری ہے؟

عصرِ حاضر میں دعوتِ دین کے بہت سے جدید طریقوں میں ایک عمومی رجحان یہ پیدا ہو گیا ہے کہ قرآنِ مجید کو براہِ راست ایک "سائنس کی کتاب" کے طور پر پیش کیا جائے۔ مختلف قرآنی آیات کو سائنسی دریافتوں کے ساتھ جوڑ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ "جدید سائنس جو کچھ آج ثابت کر رہی ہے، وہ سب کچھ قرآن نے پہلے سے کہہ دیا تھا۔" اگرچہ اس طرزِ فکر کے پیچھے دین کی عظمت کو نمایاں کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ انداز نہ صرف غیر علمی اور سطحی ہے بلکہ اسلام اور سائنس دونوں کے لیے نقصان دہ بن سکتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے، تحقیق یا تجربہ گاہ کا نصاب نہیں۔ قرآن کا مقصد انسان کو اس کے خالق سے جوڑنا، روحانی بیداری پیدا کرنا، اخلاق کی اصلاح، اور قیامت و آخرت کا شعور دینا ہے۔ قرآن کی آیات اگرچہ کائنات کی نشانیوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، مگر وہ انہیں سائنس کے اصولوں پر ثابت کرنے کے لیے نہیں، بلکہ توحید، ربوبیت، اور تدبر کی دعوت کے لیے ذکر کرتی ہیں۔

قرآن میں بیان کردہ مظاہرِ فطرت، جیسے آسمان و زمین کی تخلیق، دن و رات کی گردش، پانی، نباتات، اور انسانی پیدائش - یہ سب آیاتِ الٰہی ہیں جن پر غور کرنے سے ایمان بڑھتا ہے، لیکن ان کا مقصد تجرباتی سائنس کو بڑھانا نہیں بلکہ فکر و عبرت پیدا کرنا ہے۔

جب ہم قرآن کی آیات کو جدید سائنسی نظریات پر منطبق کرنے لگتے ہیں تو ہم لاشعوری طور پر قرآن کو سائنس کے تابع بنا رہے ہوتے ہیں۔ سائنس چونکہ بدلتی ہے، اس میں نئی تھیوریاں پرانی کو رد کرتی ہیں، تو اگر کسی آیت کی تشریح کسی موجودہ نظریے سے جوڑ

دی جائے، اور کل وہ نظریہ بدل جائے، تو قرآن کی سچائی پر سوال اٹھ سکتا ہے- حالانکہ اصل غلطی ہماری تھی، نہ کہ قرآن کی۔

مثال کے طور پر بعض لوگوں نے "بیگ بینگ" نظریے کو قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی، یا "ایکسپینڈنگ یونیورس" کو ایک مخصوص آیت کا مطلب بتایا۔ لیکن اگر کل کو بیگ بینگ رد ہو جائے، تو کیا ہم قرآن کی آیت پر شک کریں گے؟ ہرگز نہیں-اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کو سائنس کی متغیر بنیادوں پر نہ کھڑا کیا جائے۔

قرآن کو سائنس کی کتاب بنانے کے بجائے، داعی کو چاہیے کہ وہ مسلمان سائنسدانوں کی تاریخی خدمات کو سامنے لائے۔ جابر بن حیان، ابن الہیثم، الخوارزمی، الرازی، البیرونی، ابن نفیس جیسے نام نہ صرف اسلامی تہذیب کی علمی عظمت کے گواہ ہیں بلکہ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ اسلامی ایمان اور سائنسی تحقیق ایک ساتھ چل سکتی ہے۔

یہ بات جدید ذہن کو زیادہ متاثر کرتی ہے کہ مسلمان جب روحانی بصیرت اور ایمانی اخلاص کے ساتھ سائنس کی طرف متوجہ ہوئے، تو انہوں نے دنیا کو روشن کیا- اور یورپ نے انہی کی روشنی سے اپنے سائنسی سفر کا آغاز کیا۔

قرآن کو سائنس سے ثابت کرنے کی کوششیں وقتی جوش اور جذباتی اپیل تو پیدا کر سکتی ہیں، لیکن یہ نہ دعوتی حکمت ہے، نہ علمی دیانت۔ قرآن کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے: وہ ہدایت، شعور، اور روحانیت کی کتاب ہے۔ اور سائنس کو اس کے دائرے میں: وہ مادی کائنات کے مشاہدے کا علم ہے۔

جب داعی قرآن کو دلوں کے لیے روشنی، اور سائنس کو عقلوں کے لیے وسیلہ بناتا ہے۔ تو وہ دونوں کو ان کے فطری مقام پر رکھ کر اللہ کی طرف بلانے کا بہترین راستہ اختیار کرتا ہے۔

دعوت کا جذباتی منہاج

اسلامی دعوت محض دلیلوں، مناظروں اور فکری مکالمے کا نام نہیں۔ یہ دراصل دلوں کو جگانے، درد کو محسوس کرنے، اور روح کو رب سے جوڑنے کا عمل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی میں جہاں حکمت، دلیل، اور بصیرت تھی، وہیں گہرا درد، بے مثال شفقت، اور بندوں کے لیے محبت بھرا دل بھی تھا۔

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:

"لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ، عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ، حَرِيصٌ عَلَيْكُم، بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" (التوبہ:128)

ترجمہ: "تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے، تمہاری تکلیف اس پر شاق گزرتی ہے، وہ تمہارے حق میں نہایت حریص ہے، اور اہلِ ایمان پر بہت شفیق اور مہربان ہے۔"

دعوتِ دین میں جذباتی منہاج کی اہمیت

انسان صرف عقلی وجود نہیں، بلکہ اس کے اندر محبت، خوف، امید، شرم، خوشی، مایوسی، درد، رحم جیسے جذبات بھی موجود ہیں۔ اگر دعوت صرف دماغ کو مخاطب کرے، دل کو نہیں- تو وہ مکمل اثر پیدا نہیں کرتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا ایسے لمحات میں دل کو چھوا، جہاں صرف دل کی زبان کام آتی ہے۔

جذباتی منہاج کے اہم پہلو:

1. رحمت و شفقت سے دعوت:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ترین دشمنوں کے لیے بھی بددعا نہیں کی، بلکہ ہدایت کی دعا کی۔ مثلاً طائف کے موقع پر، یا اُحد میں زخمی ہونے کے باوجود۔

یہ نرم دلی دلوں پر اثر ڈالتی ہے۔

2. دعوت میں ہمدردی اور خیر خواہی:

دعوت دینے والا اگر یہ احساس دلائے کہ "میں تمہیں جیتنا نہیں، تمہیں بچانا چاہتا ہوں"، تو سامع کی دیواریں خود بہ خود گرنے لگتی ہیں۔

3. آنسوؤں، دعا اور درد کا اسلوب:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی راتیں دعاؤں، رونے، اور امت کے لیے تڑپ میں گزرتی تھیں۔ ایک داعی جب دکھ، رقت، عاجزی اور توبہ کے ساتھ بات کرتا ہے، تو نصیحت بجلی بن کر دل پر گرتی ہے۔

4. مثالیں، کہانیاں، اور ذاتی تجربات:

سچی کہانیاں، مجرب واقعات، اور انسان کی اندرونی کمزوریوں کو سمجھتے ہوئے بات کرنا- یہ دعوت کو صرف سننے کا نہیں، محسوس کرنے کا ذریعہ بنادیتا ہے۔

دل کو پگھلائے بغیر عقل کو قائل کرنا ممکن ہے، مگر دیرپا تبدیلی صرف تب آتی ہے جب دعوت عقل اور دل- دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔

جذباتی منہاج انسان کو جھکنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ خود جھکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔
یہی دعوت کا جمال ہے، یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب تھا، اور یہی ہر داعی کے لیے سب سے طاقتور ہتھیار ہے۔

ذاتی تعلق، کہانی اور تجربے کا استعمال

دعوت کی تاثیر اکثر دل کی گہرائی سے نکلنے والی بات، ذاتی تعلق کی گرمی، اور سچی زندگی کے تجربے زیادہ گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ انسان ایک ایسا مخلوق ہے جو صرف "سچ" نہیں سنتا، بلکہ "محسوس شدہ سچ" سے متاثر ہوتا ہے۔

1. ذاتی تعلق کا اثر:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز کن سے کیا؟
قریبی رشتہ داروں سے، دوستوں سے، پڑوسیوں سے۔ کیونکہ ان کے دل آپ کی محبت،

خیر خواہی اور صداقت کو جانتے تھے۔ جب آپ نے صفا پہاڑی پر فرمایا:
"اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے لشکر ہے تو مان لو گے ؟"

تو سب نے کہا: "ہاں، کیونکہ ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔"

یہی اعتماد دعوت کی پہلی سیڑھی ہے۔

دل سے دل تک رسائی صرف تعلق سے ہوتی ہے۔

اس لیے جب داعی کسی کو نصیحت کرتا ہے جس سے اس کا ذاتی تعلق ہو -دوستی، یا خیر خواہی- تو وہ بات عام وعظ سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔

2. کہانی اور مثال کا اثر:

قرآن مجید میں دعوت کا اسلوب یہ نہیں کہ صرف قانون بیان کیے جائیں، بلکہ قصص الانبیاء، واقعاتِ قومیں، اور انفرادی مثالوں سے بات کی گئی۔
یہ اس لیے کہ انسان کہانی کے ذریعے بہتر سمجھتا ہے، اور جذباتی سطح پر جڑ جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مثالیں دی:

- ایک شخص نے کتے کو پانی پلایا، تو جنت کا مستحق ہو گیا
- ایک عورت نے بلی کو قید کر کے مارا، تو جہنم کی مستحق بنی

یہ مختصر مگر جذبات کو جھنجھوڑ دینے والے واقعات سامع کے دل میں سیدھی چوٹ لگاتے ہیں-اور یہی دعوت کا اصل مقصد ہے۔

3. ذاتی تجربے کا اثر:

جب داعی خود کی زندگی کے سچے واقعات، توبہ، ہدایت، یا زندگی کے سبق سناتا ہے-تو سامع کو لگتا ہے:
"یہ صرف کتابی بات نہیں، بلکہ مجرب حقیقت ہے۔"

ایسی بات:

- سامع کو کے قریب لاتی ہے
- اس کے دل میں داعی کے لیے اعتماد پیدا کرتی ہے
- اور اسے خود تبدیلی کی طرف راغب کرتی ہے

اس لیے ایک داعی کو چاہیے کہ وہ اپنی دعوت میں صرف دلائل کا انبار نہ لگائے، بلکہ رشتہ، قصہ، اور اثر انگیز لمحے شامل کرے- کیونکہ یہی اس کی بات کو زندہ، پر اثر، اور یادگار بناتے ہیں۔

موت، آخرت، اور مقصدِ زندگی کو اجاگر کرنے کا دعوتی اسلوب

انسان روز جیتا ہے، ہنستا ہے، کام کرتا ہے، مگر ایک لمحہ ایسا آتا ہے جو سب کچھ بدل دیتا ہے - موت کا لمحہ۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اتنی یقینی اور قریب ترین حقیقت ہونے کے

باوجود لوگ موت سے غافل رہتے ہیں۔ دعوت کے میدان میں یہ غفلت یاددہانی سے دور ہو سکتی ہے، اگر داعی حکمت، نرمی، اور درد سے موت و آخرت کا تذکرہ کرے۔

1. موت کا تذکرہ: حقیقت کی طرف متوجہ کرنا

جب کوئی داعی کسی کو یہ یاد دلاتا ہے:
"کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم ہمیشہ نہیں رہو گے؟ تم بھی ایک دن زمین کے نیچے ہو گے۔ پھر؟"

تو یہ سوال انسان کے اندر کی خاموش آواز کو بیدار کرتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"لذتوں کو توڑ دینے والی چیز - موت - کو زیادہ یاد کیا کرو۔" (سنن ترمذی)

مگر دعوت میں موت کا ذکر صرف ڈرانے کے لیے نہیں، بلکہ غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے ہوتا ہے۔

2. آخرت کا تصور: جواب دہی کا احساس

جب انسان کو یہ احساس ہو کہ:
"میں مر کر ختم نہیں ہو جاؤں گا، بلکہ اللہ کے سامنے پیش کیا جاؤں گا"

تو وہ سوچتا ہے:

- میں نے جو ظلم کیا، اس کا کیا بنے گا؟

- جو نیکی چھپ کر کی، کیا وہ ضائع ہو جائے گی؟
- جو نمازیں چھوڑیں، جو گناہ کیے... کیا ان کا کوئی حساب نہیں ہو گا؟

دعوت دینے والا اگر احساسِ قیامت، حساب، میزان، اور جنت و جہنم کا تذکرہ درد دل سے کرے-تو وہ بات دل پر اترتی ہے۔

3. مقصدِ زندگی کا سوال: ہدایت کی کنجی

دنیا کا ہر انسان فطری طور پر جاننا چاہتا ہے:
"میں کیوں پیدا ہوا؟ میرا مقصد کیا ہے؟"

اگر داعی یہ سوال اٹھائے:
"کیا تم صرف کھانے، کمانے، پڑھنے، اور مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو؟"

تو انسان جھنجھلانے کے بجائے سوچنے لگتا ہے۔ یہی لمحہ دعوت کے لیے سنہرا موقع ہے۔

قرآن بار بار یہ سوال اٹھاتا ہے:

"أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا..."(المؤمنون:115)
"کیا تم نے گمان کیا کہ ہم نے تمہیں عبث (بے مقصد) پیدا کیا ہے؟"

اسلام انسان کو بتاتا ہے کہ:

- تمہاری تخلیق کا مقصد عبادت ہے
- تمہاری زندگی کا سفر آخرت کی طرف ہے

- اور تمہاری کامیابی کا معیار اللہ کی رضا ہے



خاتمہ



دعوت کا کام: ایک دائمی سفر

دعوتِ دین کوئی وقتی مہم، محدود حلقے کا پیغام یا خاص افراد کی ذمہ داری نہیں۔ یہ امتِ مسلمہ کی اجتماعی روح، ہر صاحبِ ایمان کا فرض، اور ہر دور کا زندہ مشن ہے۔ یہ وہ کام ہے جو انبیاء کی وراثت ہے، اور جس کی برکت سے امت کو "خیرِ امت" کا مقام ملا۔

دعوت صرف تقریر، نصیحت یا تبلیغ کا نام نہیں؛ یہ ایک طرزِ زندگی ہے۔ ایک داعی کا کردار، گفتار، معاملات، تعلقات، علم، حلم، رحم - سب اس کی دعوت کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں، اپنے عمل سے ایک پیغام دیتا ہے: "آؤ، تم بھی رب کی طرف لوٹ آؤ۔"

یہ سفر آسان نہیں، لیکن بابرکت ضرور ہے۔ اس میں کبھی مخالفت ہوتی ہے، کبھی تنہائی، کبھی ناکامی کا احساس، کبھی مایوسی - لیکن جو اس راستے پر اللہ کی رضا کے لیے قدم رکھے، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتا۔

قرآن میں فرمایا گیا:

"وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ"(حم السجدہ:33)

ترجمہ: "اور اس شخص سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے، اور کہے کہ میں مسلم ہوں؟"

یہی وہ روش ہے جو ہر مخلص مسلمان کو اپنانی چاہیے۔ آج دنیا میں فکر و عقیدہ کی گمراہی، نفس پرستی، الحاد، بے حیائی، اور بے یقینی کے اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان اندھیروں کو روشنی سے صرف وہی دل بدل سکتا ہے جس میں ہدایت کی تڑپ، خیر خواہی کا جذبہ، اور بندوں کو رب سے جوڑنے کا درد ہو۔

یہ کتاب اسی درد، اسی جذبے، اور اسی احساس کو جگانے کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ اگر ایک قاری بھی اسے پڑھ کر دعوت کا شعور لے کر اُٹھے، اور اپنے گھر، محلے، دوستوں یا طلبہ تک ہدایت کی خوشبو پہنچائے - تو یہ محض ایک کتاب نہیں، ایک روشنی بن جائے گی۔

دین کی دعوت صرف چند علماء کا فریضہ نہیں، ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جس کے دل میں ایمان کی روشنی ہے۔

آیئے! ہم سب مل کر اس پیغام کو آگے بڑھائیں - نرمی کے ساتھ، محبت کے ساتھ، حکمت کے ساتھ۔ کیونکہ دعوت کا سفر رکتا نہیں، یہ ایک دائمی، ربانی مشن ہے - جو قیامت تک جاری رہے گا۔

نتائج کا انحصار اللہ پر

دعوتِ دین کا کام محنت اور تدبیر سے ضرور کیا جاتا ہے، مگر اس کے نتائج کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک داعی کا فریضہ یہ نہیں کہ وہ لوگوں کو لازماً بدل کر دکھائے، بلکہ یہ ہے کہ وہ سچائی پہنچانے میں کمی نہ کرے، اخلاص میں کوتاہی نہ کرے، اور ہر حال میں اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے۔

قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا:

"إِنَّكَ لاَ تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ، وَلَـٰكِنَّ اللهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ"(القصص:56)

ترجمہ: "بیشک آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔"

یہ آیت ہر داعی کو سکھاتی ہے کہ دعوت میں کامیابی کا مطلب صرف ظاہری تبدیلی نہیں، بلکہ رب کی رضا کے لیے مسلسل محنت اور صبر ہے۔ بعض اوقات انسان سالوں دعوت دیتا ہے، مگر سامنے والا نہ بدلتا ہے- مگر اس کی وہ کوشش اللہ کے نزدیک مقبول ہو جاتی ہے، جو پلڑے میں بہت بھاری ہو گی۔

نبیوں کی سیرت میں یہی سبق ملتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے 950 سال دعوت دی، مگر ماننے والے تھوڑے ہی رہے۔ مگر وہ دن بھر، رات بھر، چپکے سے، علانیہ - ہر طریقے سے حق پہنچاتے رہے۔ کیوں؟ کیونکہ ان کا یقین اس پر تھا کہ ہدایت دینا میرا نہیں، رب کا کام ہے۔

ایک داعی کو جب یہ یقین حاصل ہو جائے کہ "میں بونے والا ہوں، اگانے والا اللہ ہے" -تو وہ نہ کبھی مایوس ہوتا ہے، نہ گھمنڈ میں آتا ہے، نہ جلد بازی کرتا ہے، نہ دل چھوٹا کرتا ہے۔

اسی لیے دعوت کے میدان میں اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان:

- نیت کو خالص رکھے
- طریقہ کو درست رکھے
- صبر اور استقامت سے کام لے
- اور ہر لمحہ اللہ سے دعا کرتا رہے

جب یہ چار صفات جمع ہو جائیں، تو چاہے دنیا کے ظاہری پیمانے پر کچھ بھی نظر آئے، اللہ کی بارگاہ میں وہ دعوت مقبول ہو چکی ہوتی ہے۔

دعوت کا نتیجہ ہدایت ہو یا انکار -دونوں اللہ کی حکمت کے تحت ہوتے ہیں، اور داعی کے لیے ہر حال میں اجر ہی اجر ہے۔

کو داعی بننے کی دعوت

دعوتِ دین کوئی مخصوص طبقے، علماء، مقررین یا جماعتوں کا محدود کام نہیں۔ یہ اس امت کی وہ اجتماعی شناخت ہے جس کے بغیر امت "امت" نہیں کہلا سکتی۔ قرآن مجید نے امتِ محمدیہ کو جو خاص لقب دیا ہے -"خیرِ امت" -اس کی بنیاد ہی دعوت پر رکھی ہے:

"كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ "(آل عمران:110)

یہ وصف صرف اس وقت باقی رہتا ہے جب ہر فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، عالم ہو یا تاجر، استاد ہو یا مزدور - اپنے دائرہ کار میں دین کی بات پہنچانے والا بنے۔

ہم نے دعوت کو اس قدر محدود کر دیا ہے کہ اسے صرف خطیب، عالم، یا جماعتوں کا کام سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"بلّغوا عني ولو آية" (صحیح بخاری)

ترجمہ: "میری طرف سے پہنچاؤ، خواہ ایک آیت ہی ہو۔"

یہ حدیث ہمیں دعوت کے دروازے پر سب سے پہلے لا کھڑا کرتی ہے۔ اگر ہمیں دین کا ایک حکم معلوم ہے، تو ہم پر لازم ہے کہ ہم وہ بات خیر خواہی سے دوسروں تک پہنچائیں۔ اگر ہم نے سچائی کو پالیا ہے، تو اس کے پیغام کے حامل بن جائیں۔

دعوت صرف تقریر نہیں، کردار بھی ہے؛ صرف درس نہیں، تعلق بھی ہے؛ صرف مسجد نہیں، بازار، دفتر، اسکول، موبائل اور سوشل میڈیا بھی ہے۔

آج کا انسان سوالات سے گھرا ہوا ہے، الجھنوں میں مبتلا ہے، اور اسے کوئی ایسا درکار ہے جو اسے محبت سے سنے، حکمت سے جواب دے، اور عمل سے راستہ دکھائے۔ یہ کام صرف وہی کر سکتا ہے جو اپنی ذات کو ایک داعی سمجھے۔

امت کے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ:

- دین سیکھے، عمل کرے اور دوسروں تک پہنچانے کا عزم کرے
- اپنی گفتگو، اخلاق، معاملات اور سوشل رویّے کو دعوت کا ذریعہ بنائے
- جس قدر علم رکھتا ہو، اسی قدر امانت داری سے حق پہنچائے
- اور سب سے بڑھ کر، رب سے دعا کرے کہ وہ اسے دین کا سچا نمائندہ بنا دے

یہی وہ تصور ہے جس سے ایک عام مسلمان بھی نبوت کی وراثت کا علمبردار بن جاتا ہے، اور دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہدایت کی روشنی پھیلانے والا چراغ بن سکتا ہے۔

